MONTHLY AWAMI JAMHURIAT LAHORE

ماہنامہ عوامی جمہوریت لاہور

★★★★

اگست 2011ء

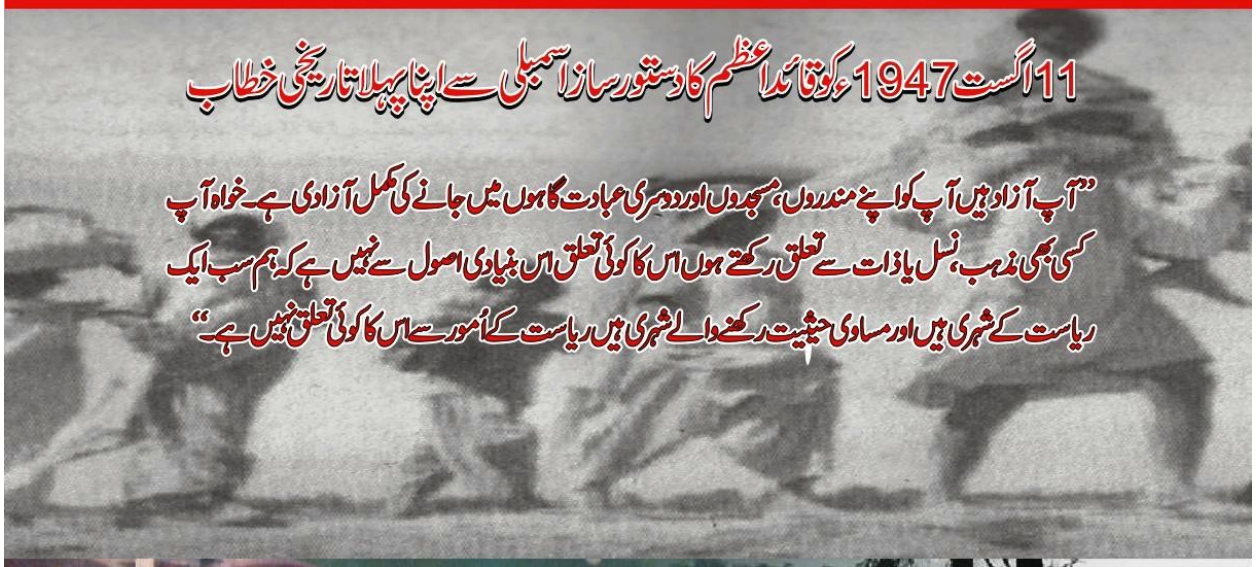

11 اگست 1947ء کو قائداعظم کا دستور ساز اسمبلی سے اپنا پہلا تاریخی خطاب

"آپ آزاد ہیں آپ کو اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جانے کی مکمل آزادی ہے۔ خواہ آپ کسی بھی مذہب، نسل یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں اس کا کوئی تعلق اس بنیادی اصول سے نہیں ہے کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری ہیں اور مساوی حیثیت رکھنے والے شہری ہیں ریاست کے اُمور سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

انسانی حقوق کے عالمی دن کے موقع پر یونیورسٹی آف گجرات میں منعقدہ سیمینار پر عابد حسن منٹو، عاصمہ جہانگیر، مہدی حسن اور دیگر مقررین خطاب کر رہے ہیں۔

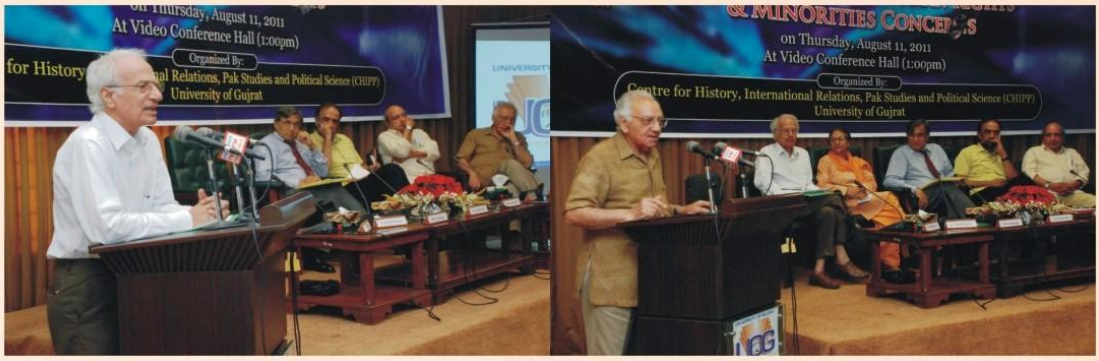

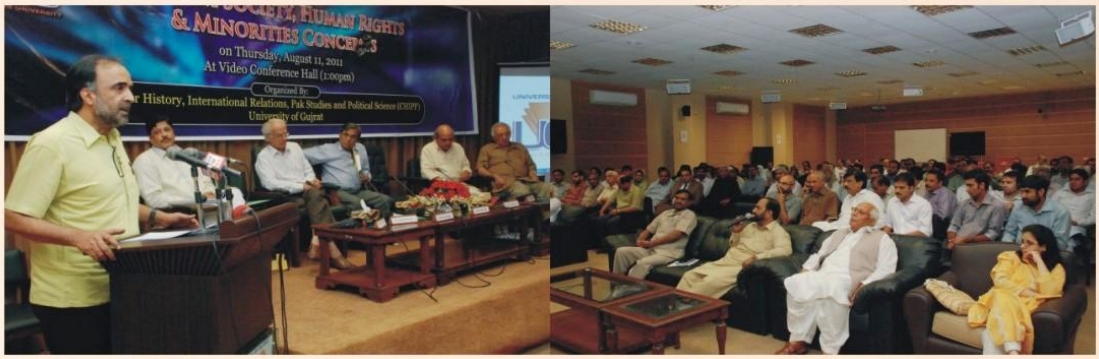

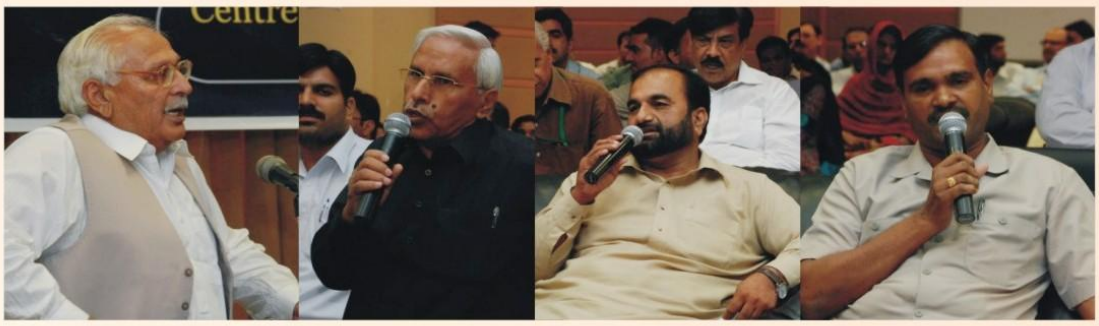

ورکرز پارٹی پاکستان کا ترجمان

CPL.NO. 279

شمارہ نمبر 5

جلد نمبر 8

MONTHLY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE

ماھنامہ عوامی جمہوریت لاہور

اگست 2011ء

قیمت 30 روپے

اس شمارے میں

فہرست

اداریہ

نواز شریف کی تقریر اور نظریہ پاکستان والے		2
فاٹا کے بارے اقدامات		3
امریکی معیشت مسلسل بحران میں		3

مضامین

سندھ کے عوام کا قومی اتحاد اور کمشنری یا مقامی حکومتوں کا نظام	اختر حسین	5
ٹوٹتا بکھرتا سیاسی ڈھانچہ	مقتدا منصور	6
پاکستان، عالمی صورتحال اور سامراج	امیر حمزہ ورک	10
پالیسیاں، اشرافیہ، عوام اور ادارے	افتخار بھٹہ	14
میر غوث بخش بزنجو، ایک تاریخ ساز شخصیت	ڈاکٹر توصیف احمد خان	16
فیض۔۔۔امن اور محبت کا پیامبر	رشید سرابھا	20

خبریں

یونیورسٹی آف گجرات کے زیراہتمام پاکستانی سماج انسانی حقوق اور اقلیتوں کے خدشات کے حوالہ سے سیمینار۔۔ایک تجزیہ	افتخار بھٹہ	22
ترقی پسند جمہوری قوتیں عوام کو حقوق ملنے تک جدوجہد جاری رکھیں گی		23
ورکرز پارٹی پاکستان پنجاب کا اجلاس	ظفر اقبال چوہدری	24
ورکرز پارٹی پاکستان ضلع شیخوپورہ......فضل پورہ یونٹ کا قیام	محمد عمران	24

پبلشر محمد اسلم ملک نے لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور سے چھپوا کر 5۔میکلوڈ روڈ، لاہور سے شائع کیا

ایڈیٹر

نعیم شاکر

مجلس ادارت

عابد حسن منٹو

اختر حسین

مسلم شمیم

رابطہ آفس

5۔میکلوڈ روڈ، لاہور پاکستان
فون: 042-37353309-37357091
فیکس: 94-42-36361531
Email:nshakir12@gmail.com
اکاؤنٹ نمبر: 01357900053903
حبیب بینک لمیٹڈ مال برانچ لاہور

سرکولیشن انچارج

نصیر ہمایوں

نواز شریف کی تقریر اور نظریہ پاکستان والے

چند دن پہلے مسلم لیگ (ن) کے لیڈر میاں نواز شریف نے ساؤتھ ایشیا فری میڈیا ایسوسی ایشن (SAFMA) کے ایک سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ برصغیر میں امن کا قیام پاکستان اور ہندوستان کے عوام کی خواہش بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اس ضمن میں انہوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی امکانات کی اہمیت پر بھی زور دیا اور اپنے دلائل میں برصغیر میں بسنے والے عوام کے الگ الگ مذہبی حوالوں کے باوجود ان کے درمیان تہذیبی اور سماجی یکسانیت کی تاریخ کے حوالے بھی دیئے۔۔۔۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کی جو لہر آج پاکستان اور پورے برصغیر میں جاری ہے اس سے بنرد آزما ہونے کے لئے پاکستان اور ہندوستان کو مشترکہ طور پر ایک صحت مند جمہوری فضا کو بحال کرنے کے لئے مشترکہ عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ نواز شریف کے یہ خیالات خوش آئند ہیں۔ اس لئے بھی کہ ان کے اور ان کی پارٹی کے بارے میں جو عمومی تاثر موجود ہے کہ وہ اور ان کی پارٹی مذہبی بنیاد پرستوں کے ہم نوا ہیں اس کو زائل کرنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی خیالات کی بنیاد پر ملک کے موجودہ کئی پے چیدہ معاملات کو حل کرنے کے امکانات کھلتے ہیں۔۔۔۔ تاہم پاکستان میں وہ لوگ جو 'نظریہ پاکستان' کے علم بردار ہیں، چلا اٹھے ہیں، سافما (SAFMA) اور نواز شریف کے خلاف بعض ٹی وی چینل، کچھ اخبارات اور کالم نویس مسلسل چیخ پکار میں مصروف ہیں کہ نواز شریف نے ''ہندوستانی لابی'' کے نمائندہ کا کردار ادا کیا ہے اور دو قومی نظریئے کو دفن کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ردعمل کچھ ایسا عجیب نہیں ہے۔۔۔۔ دو قومی نظریہ یا مذہب و قومیت کی بنیاد پر ہوتا ہے یا نہیں اور کیا پاکستان کی تشکیل کے بعد یہ نظریہ اب نظریہ پاکستان بن گیا ہے ایسی بحثیں ہیں جو ہمارے ملک میں عرصہ سے جاری ہیں اور اس وقت ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے، سوائے اس کے کہ اس نام نہاد نظریاتی مہم میں وہ تمام مذہبی عناصر جو پاکستان کی تشکیل ہی کے خلاف تھے اور وہ جو اس ملک میں مارشل لاؤں کے ہم نوا رہے ہیں اور وہ جو پاکستان کو ایک جدید جمہوری ملک اور معاشرہ بنانے کے خلاف ہیں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔۔۔۔ پاکستان معرض وجود میں آچکا اور ایک جغرافیائی اور سیاسی حقیقت ہے، اس ملک میں کیسا سماج، کیسی معیشت اور کیسا سیاسی نظام قائم ہو، اس کا فیصلہ نہ فوج کر سکتی ہے اور نہ ہی نام نہاد مذہبی عناصر جو اکیسویں صدی میں قرنِ وسطی کے خواب دیکھتے ہیں اور تاریخ اور سماج کے جدلیاتی عمل سے نا آشنا ہیں۔۔۔۔ یہ مسلمانوں کے متبرک ترین مقامات اور عرب سرزمین پر تیل کی دولت کو بادشاہوں کے سپرد کرنے اور اس عہد جمہور میں نیم غلامی کے معاشروں سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔۔۔۔ پاکستان کو بنانے اور سنوارنے کا کام جنگی جنون، مذہبی فرقہ بازی، برصغیر میں پیہم کشمکش اور جنگی صورت حال کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔۔۔۔ یہ عوام کے جمہوری عمل کے ذریعے ممکن ہے، عوام جو مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی اور جو سنّی، شیعہ اور دوسرے مسلکوں کے پیروکار ہونے کے باوجود ایک مشترکہ تہذیب اور معیشت کے وارث ہیں۔۔۔۔ یہ عوام ہندوستان میں بھی ہیں اور پاکستان میں بھی اور نہ وہاں کے بنیاد پرست اور یہاں کہ کٹ ملا ان کی جمہوری جدوجہد، امن اور ترقی کی خواہشات [جو خالص مادی ہیں] کے راستے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

فاٹا کے بارے اقدامات

فاٹا یعنی وفاقی انتظام کے تحت قبائلی علاقے [Federally Administered Tribal Areas] جہاں ایف سی آر (Frontier Crimes Regulation) نافذ ہے، پاکستان کی مغربی سرحد پر واقع ہیں۔ ان اور دوسرے کچھ قبائلی علاقے جو پاٹا یعنی صوبائی انتظام کے تحت قبائلی علاقے (Provincial Administered Tribal Areas) کہلاتے ہیں، ان کی الگ قبائلی حیثیت اور ان کا الگ انتظامی اور قانونی ڈھانچہ انگریز حکومت کے زمانے سے قائم ہے۔۔۔۔ آزادی کے بعد سے ان علاقوں کو پاکستانی ریاست کے دوسرے حصوں کی طرح یعنی آئین پاکستان کے مطابق عمومی سسٹم کا حصہ بنانے کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔۔۔۔ اب آزادی کے تریسٹھ 63 سال بعد ان علاقوں کے الگ ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی تو نہیں کی گئی البتہ بعض ایسے اقدامات کئے گئے ہیں جو مروجہ ایف سی آر کی سنگینی کو کم کرنے کا باعث ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ ایف سی آر کے تحت ملزمان کو ضمانت کا حق حاصل نہیں تھا جواب حاصل ہوگا، نہ ہی ملزمان کو اپیل کا حق تھا جواب مل گیا ہے۔ تاہم مقدمات کی شنوائی عام عدالتی نظام کے مطابق نہیں ہوگی، نہ ہی اپیل کسی باضابطہ عدالت میں ہوگی بلکہ ایک خصوصی ٹریبونل کرے گا۔۔۔۔ پاکستان کے عدالتی نظام کی اعلیٰ عدالتوں کو [یعنی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ] ان علاقوں کے معاملات میں حق سماعت نہیں ہے۔۔۔۔ سیاسی سطح پر اب سیاسی پارٹیوں کا قانون یعنی political parties order فاٹا میں نافذ ہوگا یعنی سیاسی پارٹیاں قانوناً اب ان علاقوں میں کام کرنے کی مجاز ہوں گی۔۔۔۔ اس سے پہلے ان علاقوں میں وفاقی سطح پر پارلیمانی اداروں میں نمائندگی رائج کی گئی تھی تاہم قانوناً یہاں انتخاب سیاسی پارٹیوں کے حوالے سے نہیں ہوتے تھے۔

یہ اقدامات موجودہ صورتحال میں تبدیلی کی طرف ایک قدم ہیں، تاہم یہ علاقے جن تبدیلیوں کا تقاضہ کرتے ہیں وہ ابھی دور کی بات ہے۔۔۔۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے پاکستانی آئین اور قوانین کے حوالے سے قبائلی علاقوں کی خصوصی حیثیت کی کچھ تفصیل کا بیان ضروری ہے۔

آئین کی دفعہ ایک میں پاکستان میں شامل علاقوں کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ چار صوبوں [بلوچستان، خیبر پختونخواہ، سندھ، پنجاب]، فیڈرل کیپیٹل کے علاوہ وفاقی انتظام کے تحت قبائلی علاقے اور کچھ دوسرے علاقے شامل ہیں۔ آئین کے آرٹیکل 246 میں ''قبائلی علاقے'' کی تعریف درج ہے جس کے مطابق وفاقی اختیار کے قبائلی علاقوں کی تفصیل یوں ہے۔ (i) ضلع پشاور سے ملحقہ قبائلی علاقے۔ (ii) ضلع کوہاٹ سے ملحقہ قبائلی علاقے۔ (iii) ضلع بنوں سے ملحقہ قبائلی علاقے۔ (iiia) ضلع لکی مروت سے ملحقہ قبائلی علاقے۔ (iv) ضلع ڈیرہ اسماعیل خان سے ملحقہ قبائلی علاقے۔ (iva) ضلع ٹانک سے ملحقہ قبائلی علاقے، (v) باجوڑ ایجنسی۔ (vi) مہمند ایجنسی۔ (vii) خیبر ایجنسی۔ (viii) کرم ایجنسی۔ (ix) شمالی وزیرستان ایجنسی، اور (x) جنوبی وزیرستان ایجنسی۔ آرٹیکل 247 کے تحت ان قبائلی علاقوں کا انتظام وفاق کے اختیار میں ہے اور صدر پاکستان اس بارے میں احکامات جاری کرنے کے مجاز ہے۔ پارلیمنٹ کا بنایا ہوا کوئی قانون ان علاقوں میں صدر کے حکم کے بغیر نافذ نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔ جن امور پر پارلیمنٹ کو قانون بنانے کا اختیار ہے ان امور کے بارے میں صدر قبائلی علاقہ جات میں ریگولیشن جاری کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور آئین سے قطع نظر صدر کو ہر معاملے میں ریگولیشن جاری کرنے کا اختیار ہے جس کا مقصد ان علاقوں میں امن اور اچھی حکومت (good governance) قائم کرنا ہو۔۔۔۔۔ صدر جب چاہے کسی علاقے کو بھی قبائلی علاقے سے خارج کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کو ان علاقوں میں اس وقت تک کوئی اختیار حاصل نہیں ہے جب تک پارلیمان اس بارے میں کوئی قانون نہ بنائے۔۔۔۔۔

آئین کی ان دفعات سے ظاہر ہے کہ اگرچہ قبائلی علاقاجات پاکستان کا حصہ ہیں لیکن ان کے انتظامی ڈھانچہ اور ان کے بارے میں قانون سازی کا طریقہ بنیادی طور پر مختلف ہے۔ قانون سازی کا اختیار صدر کو ہے نہ کہ پارلیمان اور انتظامی امور کا کنٹرول بھی صدر کے پاس ہے۔۔۔۔۔ عدالتی نظام بھی الگ ہے جس میں اہم بات یہ ہے کہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے آئینی اختیارات سے یہ علاقے اور یہاں کی انتظامیہ آزاد ہے۔۔۔۔۔ یہ سب صورت حال 1973ء کے آئین کے مطابق ہے جو آزادی کے 26 سال کے بعد بنا اور جس میں اٹھارویں اور انیسویں ترامیم کے باوجود اب تک کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی۔۔۔۔۔ ایسے میں یہ علاقے پاکستان کے عمومی سیاسی، سماجی اور انتظامی دھارے سے باہر رہے ہیں۔ جمہوری عمل [جس قسم کا بھی ہمارے ملک میں رہا ہے] کے جو بھی اثرات مرتب ہو سکتے تھے ان سے اس علاقے کو الگ رکھا گیا ہے۔ یہاں سے پارلیمان کے لئے انتخاب بھی ہوتے ہیں اور اس وقت قومی اسمبلی کے لئے 12 اور سینیٹ کے لئے 8 ممبر منتخب کئے جاتے ہیں تاہم انتخاب کا طریقہ کار بھی صدر کی صوابدید پر منحصر ہے۔ البتہ عورتوں کے لئے کوئی خصوصی نمائندگی کا قانون اب تک موجود نہیں ہے۔۔۔۔۔ اس پس منظر میں قبائلی علاقہ جات کی سماجی اور سیاسی زندگی میں کسی بنیادی تبدیلی کے امکانات معدوم تھے بلکہ یہ صورت حال قبائلی سماج ہی کو قائم رکھنے کا کام کرتی ہے۔ پاکستانی سماج کے بالادست طبقات اس صورت حال کو اور قبائلی سرداروں کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہی علاقے آج مذہبی شدت پسندوں، دہشت گردوں اور ماورائے آئین و قانون برسرعمل گروہوں، جو مقامی بھی ہیں اور غیر ملکی بھی کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان علاقوں کی پسماندہ معیشت، سماج اور انتظامی ڈھانچے کو بتدریج تبدیل کیا جاتا، اگر ایسا کیا جاتا تو نصف صدی سے زائد کا عرصہ قبائلی علاقوں کو پاکستان کے عمومی ریاستی نظام اور سماجی دھارے کا حصہ بنانے کے لئے کافی تھا۔ تاہم جو برسر اقتدار لوگ [چاہے وہ سیاسی، مذہبی اور فوجی ہوں] ملک کے سیاہ و سفید کے مالک رہے ہیں، وہ پاکستان کے پہلے پانچ اور 1971ء کے بعد سے چار صوبوں کو بھی کسی ترقی یافتہ [یا کم از کم ترقی پذیر] سماج میں بدلنے کی بجائے اسے جوں کا توں بلکہ اور زیادہ پسماندہ بنانے اور اپنے گھٹیا مفادات کو جائز اور ناجائز طریقوں سے محفوظ کرنے میں مصروف رہے ہیں۔۔۔۔۔ پاکستان میں فوج کا سیاسی اور معاشی طاقت بننا اور حاکم کا درجہ حاصل کرنا، بڑے زمینداروں کا ملک کی 60 فیصد سے زائد آبادی پر براہِ راست تسلط اور یہاں کے معاشی مافیا اور قبضہ گروپوں کی افزائش کرپشن کی ہر لہر، اور مذہب اور کلچر کو مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے نتیجے آج ہمارے سامنے ہیں۔

ورکرز پارٹی پاکستان نے اپنی بنیادی دستاویز میں دو باتیں کہی ہیں، جنہیں یہاں دہرانا ضروری ہے، پہلی یہ کہ پاکستان ایک کثیر القومی ملک ہے اور ایک ایسے وفاقی نظام کا تقاضہ کرتا ہے جہاں تمام وفاقی اکائیوں کو اپنے وسائل پر اختیار اور اپنے تہذیبی ورثہ کے تحفظ کا اختیار ہو۔ اور دوسرے یہ کہ قبائلی علاقہ جات کو ان کے معاشی، لسانی اور کلچرل حوالوں سے متعلقہ صوبوں کا حصہ بنایا جائے۔۔۔۔۔ بہرحال موجودہ اصلاحات صرف ایک حد تک کچھ مسائل کو حل کرنے کی ایک کوشش ہے، تاہم معاملات اس سے زیادہ پے چیدہ ہیں اور ایک مستقل دیرپا منصوبہ بندی کا تقاضہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔

امریکی معیشت مسلسل بحران میں

چند دن پہلے امریکہ کے نائب صدر بائیڈن نے چین کے دورے کے دوران چینی وزیر اعظم کو یقین دلایا کہ امریکہ قرضوں کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی (ڈیفالٹ) نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ یاد رہے کہ امریکہ نے چین سے 1 1/2 ٹریلین (کھرب) ڈالرز کا قرضہ لے رکھا ہے اور اس یقین دہانی کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ امریکی معیشت مسلسل بحران کا شکار ہے۔۔۔۔۔ اسی دورے کے دوران کسی چینی اہلکار نے نائب صدر کے سامنے حیرت کا اظہار کیا کہ امریکی آمدنی سے زیادہ بیدریغ خرچ کیوں کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ قصے اس ملک کی معیشت کے بارے

میں ہیں جسے دنیا کی سب سے بڑی معیشت کہا جاتا ہے اور جس کا اقتصادی اتار چڑھاؤ پوری دنیا پر اثر انداز ہوتا ہے۔۔۔۔۔ابھی چند ہفتے پہلے امریکی صدر اور ان کی پارٹی (ڈیموکریٹک) کو اس وقت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا جب بجٹ خسارے کو پورا کرنے کے لئے طبقہ امراء پر ٹیکس میں اضافہ کی ان کی تجاویز کو ریپبلکن پارٹی نے مسترد کر دیا اور انہیں حکومتی خرچے کم کرنے پر مجبور کر دیا۔۔۔اور پھر امریکہ کی مارکیٹ ریٹنگ بھی ایک درجے کم ہوگئی۔۔۔۔

یہ معاملہ امریکی معیشت سے خاص نہیں ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام [امریکہ جس کا سب سے بڑا نمائندہ ہے] کا بحران ہے۔۔۔۔۔سرمایہ دارانہ نظام منافع اور سرمائے کی افزائش کی ہوس پر قائم ہے اور مقصد کے لئے وہ محنت کشوں اور دوسرے کارکنوں کے استحصال کے براہِ راست اور بالواسطہ طریقے پیدا کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کشمکش اور تضاد کو کم کرنے اور اپنی لوٹ اور استحصال کے عمل کو مزید وسیع کرنے کے لئے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں نے نوآبادیاتی قبضے اور سامراجی پھیلاؤ کے راستے اختیار کئے۔ اپنی منڈیوں کے تحفظ اور خام مال کے حصول کو یقینی بنانے کے لئے عالمی اور علاقائی جنگیں لڑیں، اسلحہ سازی کی، ایٹم بم بنائے اور صرف اپنی طاقت کی دہشت کے اظہار کے لئے یہ بم استعمال کئے۔۔۔۔۔سرمایہ دارانہ سامراجیت کا موجودہ شاخسانہ کارپوریٹ گلوبلائزیشن ہے، جس کے نتیجے میں دنیا بھر کو ایک وسیع منڈی میں تبدیل کرنے، چند بڑے سرمایہ دار ممالک کو امریکی سربراہی میں اکٹھا کرنے [جی 7] اور دنیا بھر میں سامراجی مالیاتی سرمائے کے پھیلاؤ کو یقینی اور محفوظ بنانے کا کام کیا گیا۔ اگرچہ سرد جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا اور عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام کے مقابل سوشلسٹ بلاک موجود نہیں رہا تھا اس کے باوجود اسلحہ سازی جاری رہی، فوجی اڈے قائم رہے اور ناٹو (NATO) جیسے ادارے زندہ رکھے گئے۔۔۔۔۔یہ سب سرمایہ دارانہ نظام ہی کی پشت پناہی کے طریقے تھے۔۔۔۔۔ ہوسِ منافع اور افزائش سرمایہ کی اس بنیادی سرمایہ دارانہ سرشت نے نئے نئے طریقے ایجاد کئے جن کی ایک صورت سٹہ بازی (speculation) کی بنیاد پر سرمایہ کاری کرنا ہے۔۔۔۔۔آج تمام سرمایہ دار ممالک اور بالخصوص امریکہ اس کا شکار ہیں۔۔۔۔۔اس کاروبار نے اس کرپشن کو جو سرمایہ داری نظام کا حصہ ہے مزید تقویت پہنچائی۔۔۔۔۔چنانچہ امریکی معیشت کا بحران جدید سرمایہ داری کا ہی بحران ہے۔2008ء میں جب امریکہ میں شدید مالیاتی اور معاشی بحران پیدا ہوا، بنک، انشورنس کمپنیاں اور دوسرے مالیاتی ادارے گرنے لگے اور کنگال ہوئے، تو بحران کا حل انہی اداروں کو از سرِ نو کھڑا کرنے کے لئے اربوں ڈالر کی مدد فراہم کی گئی یہ سرمایہ عوام کی جمع پونجی اور ٹیکسوں کی بھرمار سے حاصل ہوا تھا اور اس کا اس طرح استعمال عوام ہی کے اوپر مزید بوجھ بن کر نازل ہوتا۔۔۔۔۔آج امریکہ میں بے روزگاری بھی پھیل رہی ہے اور عوامی فلاح کے منصوبے بھی ختم کئے جا رہے ہیں، مگر بحران ہے کہ تھمتا ہی نہیں اور نت نئے راستوں سے نمودار ہوتا رہتا ہے۔۔۔۔۔یہ بحران اب سرمایہ دار دنیا کا مقدر ہے، نہ یورپ نہ جاپان اور نہ ہی دوسرے ملک اس کی دست برد سے آزاد ہیں۔

اس سارے پس منظر کے باوجود عالمی سرمایہ داری نظام فی الحال موجود ہے، امریکہ سمیت بڑے سرمایہ دار ممالک میں متبادل معاشی نظام اور سرمایہ داری کے خاتمے کی تحریکیں کمزور ہیں، اکیسویں صدی میں سوشلزم کیا ہے اور کیسے اس کا راستہ کھلے گا، اس بارے میں تحقیقی اور تخلیقی کام بہت کم ہے اور اس کے بغیر اس عہد کے نئے انقلابات کا راستہ کھلنے میں ابھی کچھ دیر ہے۔

پاکستان جیسے ممالک میں بائیں بازو کی تحریک کو مضبوط کرنا، عالمی سامراج کے ہم نوا طبقات اور ان کی سیاست کے مقابل عوامی سیاست کے فروغ کی جدوجہد ہمارے لئے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، یہ عمل ہمارے جیسے ممالک میں عوام دشمن معاشی نظام جو بالخصوص جاگیرداری اور سامراجی مفادات پر مبنی ہے، کو توڑنا اور عوام کی فلاح پر مبنی جمہوری نظام کا قیام اپنے ملک میں ترقی کے راستے کھولے گا اور عالمی سرمایہ داری نظام کی گرفت کو کمزور اور اس کے اندرونی بحران کو مزید گہرا کرے گا۔

قارئین سے اپیل

ماہنامہ ''عوامی جمہوریت'' ورکرز پارٹی پاکستان کا ترجمان رسالہ ہے جو ملک کے پسماندہ عوام اور محنت کش طبقات کی حاکمیت کے لئے مصروف جدوجہد ہے۔ ماہنامہ ''عوامی جمہوریت'' آپ دوستوں کے تعاون سے جاری ہے۔ جس میں سیاسی، سماجی، معاشی اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں مضامین اور محنت کشوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ماہنامہ ''عوامی جمہوریت'' نہ صرف آپ کے ساتھ رابطہ کا ذریعہ ہے بلکہ نظریاتی اور مطالعاتی لٹریچر کے ذریعے ساتھیوں کی سیاسی اور نظریاتی تربیت بھی مقصود ہے۔ لہٰذا اس اہم فریضہ کے لئے آپ سب کے مالی اور قلمی تعاون کی ضرورت ہے تاکہ رسالہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے۔

آپ کے تعاون کا شکریہ

(ایڈیٹر)

سندھ کے عوام کا قومی اتحاد اور کمشنری یا مقامی حکومتوں کا نظام

اختر حسین

ویسے تو پورا ملک ہی زبردست بدامنی، بے چینی، مذہبی انتہاپسندی ودہشت گردی، قتل وغارت گری، بھوک، افلاس اور سماجی، معاشی وسیاسی بے چینی کا شکار ہے مگر صوبہ سندھ کے سب سے بڑے شہر کراچی میں چند ماہ کے اندر سیکڑوں افراد کا قتل وخون ہو چکا ہے۔ ہزاروں زخمی اور کروڑوں، اربوں کی جائیدادیں تباہ ہوئی ہیں، کہیں زبان کے نام پر، کہیں علاقایت ومذہبی مفاہمت کے نام پر حکمرانوں کے پاس ان حالات کو درست کرنے کی کوئی کمٹمنٹ ہی نظر میں آتی محض بیان بازی جاری ہے، حکومت کے اندر اور باہر مختلف سیاسی پارٹیاں اور گروپ ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے اور لو، دو کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس بدامنی اور قتل وغارت گری کے پیچھے مختلف قسم کے مافیاز کا ہاتھ ہے یا ان سیاسی پارٹیوں کے کھلاڑی خود مافیا کا کام کر رہے ہیں کہیں لینڈ مافیا، ڈرگ مافیا یا اسلحہ مافیا ہے۔

موجودہ حکومت کے مختلف حصوں پی پی پی، ایم۔کیو۔ایم، اے این پی یا مسلم لیگ کے اتحاد ونفاق کی کوئی اصول بنیاد یں نظر نہیں آتیں۔ اپنے اپنے مفادات کے لیے ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے کی پالیسی پر گامزن ہیں کبھی حکومت کے اندر کبھی باہر اور پھر اندر، ہمارے قوم پرست بھی عوام کے معاشی وسماجی مسائل اور سندھ کی قومی وحدت کو قائم رکھنے کی بنیادوں پر واضح پروگرام اور لائحہ عمل اختیار کرنے کی بجائے حکمرانوں ہی کی بچھائی ہوئی بساط پر کھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حکومت تو اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے مختلف تنازعات کھڑے کرتی ہے اور حزب اختلاف کی سیاسی پارٹیاں اسی میں الجھتی رہتی ہیں کیونکہ ان کے پاس بھی عوام سے کوئی کمٹمنٹ ہی نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال سندھ حکومت کی طرف سے بدنیتی کی بنیاد پر ایک ہی لمحے میں سندھ اسمبلی کے اندر 2002 کے پولیس قانون کو ختم کر کے 1861 کے سامراجی پولیس قانون کا نفاظ اور 2001 کے مقامی حکومتوں کے قانون کو ختم کر کے آرڈیننس کے ذریعے بڑے دو شہروں کراچی اور حیدرآباد میں 2001 کے مقامی حکومتوں کا قانون اور باقی ماندہ سندھ میں 1979 کا بلدیاتی نظام پھر دوسرے آرڈیننس کے ذریعے پورے سندھ میں 2001 کا قانون نافذ کر دیا۔ جس کے ردِعمل میں پورے سندھ میں قوم پرستوں نے کمشنری نظام کی بحالی کی حمائیت میں ہڑتال کرائی، کچھ گروپوں نے ہڑتال کی حمایت قومی وحدت کے نام پر کی کمشنری نظام تو انگریز کی قائم کردہ نوکر شاہی کا طرز حکومت ہے جس کا اتحادی بڑا زمیندار اشرافیہ ہے جو ہمیشہ عوام کی اپنے ماتحت رکھ کر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں، ہمارے یکے بعد دیگرے فوجی حکمرانوں نے مرکزیت کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے آئین کے تحت عوام کے منتخب کردہ وفاقی پارلیمانی نظام اور اقتدار کی اوپر سے نیچے تقسیم کی نفی کی اور اپنی کھلی منافقت سے بلدیاتی اداروں کو سیاست کی بنیاد بنایا۔ اب جب کہ آئین کی حکمرانی بحال ہوگئی ہے ہمیں وفاقی پارلیمنٹ کی بالادستی واقتدار اعلیٰ اور وفاقی اکائیوں میں صوبائی اسمبلیوں کی مضبوطی اور وفاق سے اختیارات کی صوبوں اور صوبوں سے نیچے عوامی سطح پر یعنی شہروں ضلعوں تھلوں اور گوٹھ / دیہات تک محنت مقامی حکومتوں اور پنچائتی نظام کے ذریعے منتقل کی ضرورت ہے جس میں نوکر شاہی اس کے تابع ہو، اس کی شروعات 2001 کے قانون میں بڑے پیمانے پر ترمیم سے ہوسکتی ہے اور اس قانون کے تحت فوری انتخابات کی ضرورت ہے۔ آج حکمران طبقات کی سیاسی پارٹیاں اور میڈیا بھی اس حقیقت کو پھر دبانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستان ایک کثیر القومی ریاست ووفاقی مملکت ہے، وفاقی اکائیوں کے عوام کا معاشی وسماجی ترقی کے لیے اپنے اپنے صوبوں کے اندر معاشی وسائل پر کنٹرول ضروری ہے، اٹھارویں آئینی ترمیم نے بھی اس مسلے کو مکمل طور پر حل نہیں کیا ہے اور وفاق سے معاشی وسائل کے حصول کی جدوجہد تمام وفاقی اکائیوں کے عوام مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ سندھ کی قومی وحدت کو قائم رکھنے سے کوئی دورائے نہیں ہیں مگر ایک ایسی قومی وحدت جس میں مختلف زبانیں بولنے والے عوام شامل ہوں ان کا اتحاد وایکا قائم کرنا ضروری ہے اس سے یہ قومی وحدت مضبوط ہوگی اور یہ ہمارے صوبے کی معاشی وسماجی ترقی سے ہی ممکن ہے یہ دیہاتوں اور شہروں میں جاگیرداروں اور بڑی زمینداریاں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اس لئے سندھ کے دیہی عوام کی معاشی وسماجی ترقی کے لئے بڑے پیمانے پر زرعی اصلاحات، زمین کی ہاریوں وکھیت مزدوروں میں تقسیم ضروری ہے، زمیندار اشرافیہ کے خاتمے سے ہی اقتدار نیچے تک منتقل ہوگا ہمیں بڑے پیمانے پر صنعتی ترقی کی ضرورت ہے، ہمیں سامراجی سازشوں اور مداخلت کا مقابلہ، امن جمہوریت، علاقائی ممالک کے درمیان دوستی اور معاشی روابط سے کرنا ہے، ہمیں مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا مقابلہ تعلیم کی ترقی اور مختلف قسم کی گروہی، فرقہ وارانہ وعلاقائی منافرتوں کے خلاف جدوجہد سے کرنا ہے ایسی ہی مشترکہ پروگرام وجدوجہد سے سندھ کے عوام کا قومی اتحاد ہوگا اور سندھ کی قومی وحدت مضبوط ہوگی۔

نظم

روک ،ٹوک ،تلاشی ،ناکے نیں
دِنیں دپہریں راتیں ڈاکے نیں
کھیتاں دے وچ نچن فصلاں
گھر گھر نچدے فاقے نیں
سجن رلدے پھر دے نیں
مخبر چڑھے ہوئے ٹاہکے نیں
پتہ نہ لگے جج چڑھی
یاں بندے مار دھماکے نیں
ودھ کے ہتھ نہ ڈکدا کوئی
کاہدے خوف تے جھاکے نیں
اپنے شہر تے گلیاں محلے
لگداا ے غیر علاقے نیں

عظمت نصیب، پیرس

ٹوٹتا بکھرتا سیاسی ڈھانچہ

مقتدا منصور

گذشتہ ماہ مسلح افواج کے سابق سربراہ مرزا اسلم بیگ ،جنہیں 1988 میں قائم ہونے والی پیپلز پارٹی کی حکومت نے تمغہ جمہوریت دیا تھا،فوج کے موجودہ سربراہ کو ایک طویل خط لکھ کر ان سے ملک کو درپیش مختلف نوعیت کے بحرانوں کے حل میں کردار ادا کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔انہوں نے جنرل کیانی کو لکھا ہے کہ اس سے قبل کہ مسلسل حکم عدولی سے تنگ آ کر فاضل عدلیہ کے تمام جج صاحبان مستعفی ہوجائیں اور ملک ایک نئے آئینی بحران کا شکار ہوجائے،وہ آئین کے آرٹیکل 190 کے تحت قدم اٹھاتے ہوئے اس ملک کو اس آئینی بحران سے نکالنے میں اپنا کردار ادا کریں،وغیرہ وغیرہ۔تجزیہ نگاروں کے مطابق ان کے اس خط کا واضح مطلب فوج کو ایک بار پھر بالواسطہ یا بلاواسطہ اقتدار پر قابض ہوجانے کی دعوت دینا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ حکومت کی غیر ذمہ دارانہ حکمت عملیوں کے سبب ملک اس وقت نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔ایک طرف بجلی اور گیس کی کمیابی نے صنعتی پیداوار میں کمی کے نتیجے میں معاشی نمو کی شرح کو تشویشناک حد تک کم کردیا ہے، جبکہ دوسری طرف امن وامان کی صورتحال انتہائی ناگفتہ بہ ہوچکی ہے۔اس پر طرّہ یہ کہ حکومت تسلسل کے ساتھ عدالتی احکام پر عملدرآمد سے گریز کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے۔خاص طور پر اعلیٰ ترین عدالت میں زیر سماعت کرپشن اور بدعنوانیوں کے مقدمات میں حکومت کا رویہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے،جن کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ ان میں اعلیٰ شخصیات کی اولادیں ملوث ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حکومت جس انداز میں عدالتی احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرکے عدلیہ کی آئینی حیثیت کو چیلنج کررہی ہے اس سے ادارہ جاتی تصادم کے خطرات اپنی جگہ موجود ہیں جو کسی بھی وقت شدت اختیار کرسکتے ہیں۔یہ صورتحال پاکستان جیسے ملک کیلئے جو اسوقت مختلف النوع قسم کے مسائل کی گرداب میں پھنسا ہوا ہے ایک تازیانے سے کم نہیں ہے۔یہ بھی واضح ہے کہ ادارہ جاتی تصادم کی صورت میں پہلے سے لاقانونیت اور امن وامان کی بدترین صورتحال سے دوچار اس ملک میں انتشار chaos کی ایک نئی اور خوفناک فضا پیدا ہوسکتی ہے جس سے ملک کے وجود کو نئے خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔

معاملہ صرف ریٹائرڈ فوجی افسران تک محدود نہیں ہے بلکہ کچھ دیگر حلقے بھی اس ادارہ جاتی تصادم سے بچنے کیلئے فوج کے کردار کے منتظر ہیں۔اس سلسلے میں ایک انگریزی روزنامے میں شائع ہونے والا سابق بیوروکریٹ اقبال جعفری کا مضمون بھی اہمیت کا حامل ہے جو کم وبیش جنرل اسلم بیگ کے خط کے متن سے ملتا جلتا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے جنرل اسلم بیگ کے برخلاف فوج سے براہ راست مداخلت کی استدعا کی ہے۔ان کے خیال میں موجودہ صورتحال میں جب آئینی تعطل پیدا ہوچکا ہو اور انتظامیہ عدلیہ کے مدمقابل آ گئی ہو تو فوج ہی ملک کو اس بحرانی صورتحال سے نکالنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ پانچواں مارشل لا سابقہ مارشل لاؤں سے قطعی مختلف ہوگا۔لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فوجی مداخلت کے علاوہ کوئی اور ایسا راستہ باقی نہیں بچا ہے کہ اصلاح احوال ممکن ہوسکے۔اس مسئلے پر ملک کی سول سوسائٹی کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ درست ہے کہ آئین کے مصنفین نے بہت غور وخوض کے بعد آئین میں آرٹیکل 190 شامل کیا ہے کیونکہ ان کے مدنظر ایسے خدشات رہے ہوں گے کہ جب انتظامیہ اپنے اختیارات کے بل بوتے پر عدلیہ کے احکامات سے روگردانی کرتے ہوئے ملک میں آئینی بحران کا سبب بن جائے۔اسلئے عدلیہ کو اس آئینی شق کے ذریعہ یہ اختیار دیا گیا ہے کہ جب سول انتظامیہ عدلیہ کے احکامات پر عمل درآمد سے مسلسل گریز کی پالیسی اختیار کرے اور عدالتی احکامات کی تعمیل میں رکاوٹ بن جائے تو عدلیہ اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کیلئے فوج سے رجوع کرے۔لازمی طور پر آئین سازوں کے سامنے مختلف ادوار میں قائم ہونے والی حکومتوں کی بڑھتی ہوئی مطلق العنانیت،سیاسی قوت کے بے جا استعمال اور عدالتی فیصلوں سے طاقت کے بل بوتے پر روگردانی کی مثالیں رہی ہوں گی۔جب ہی انہوں نے اس شق کے ذریعہ عدلیہ کو اپنے احکامات کی تعمیل کیلئے فوج کی مدد حاصل کرنے کا اختیار دیا ہے۔

لیکن اس شق میں فوج طلب کرنے کے طریقہ کار یعنی modus operandi کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔یعنی کیا عدلیہ براہ راست آرمی چیف کو یہ حکم دے گی کہ وہ اس کے احکامات پر عمل کروائے یا محکمہ دفاع کے ذریعہ آرمی چیف کو مخاطب کرے گی۔پاکستان کی عدالتی تاریخ میں 1998 میں صرف ایک مرتبہ اسوقت کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے اپنے احکامات کی تعمیل کیلئے براہ راست آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت سے مداخلت کیلئے رجوع کیا تھا۔مگر جنرل جہانگیر کرامت نے اس وقت کے معروضی حالات کے پیش نظر عدلیہ سے معذرت کرلی تھی اور یوں جسٹس سجاد علی شاہ کو مستعفی ہونا پڑا تھا۔لیکن اس وقت صورتحال قطعی مختلف تھی کیونکہ محاذ آرائی صرف نواز شریف کی حکومت اور چیف جسٹس کے درمیان تھی۔جبکہ اس مرتبہ پوری عدلیہ ایک طرف ہے اور حکومت دوسری طرف کھڑی ہے اور مقدمات کی نوعیت بھی اس وقت کے مقابلے میں خاصی مختلف ہے۔

لیکن یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں،جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔اول یہ کہ حکومت کی تمام تر غلط حکمت عملیاں اور آرٹیکل 190 کے حق میں دیئے جانے والے دلائل وبراہین اپنی جگہ،مگر کیا صورتحال اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ آرٹیکل 190 کے تحت کاروائی کے علاوہ کوئی اور آپشن باقی نہ بچا ہو؟ دوئم کیا اس ملک میں پیدا ہونے والے بحرانوں کا واحد حل فوجی مداخلت ہے؟ سوئم کیا ملک میں چار مرتبہ فوجی حکومتیں قائم ہونے کی صورت میں قومی مسائل حل ہوئے ہیں یا ان میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں؟ چہارم کیا سول سوسائٹی کے

مختلف شراکت داراس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ حکومت پر عدالتی فیصلوں کا احترام کرنے کیلئے دباؤ بڑھاسکیں؟اگر ان سوالات کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ اول الذکر تین سوالات کے مقابلے میں چوتھے سوال میں موجودہ صورتحال کا حل ممکن ہے۔۔یعنی سیاسی تحریک کے ذریعہ حکومت پر دباؤ۔اگر سول سوسائٹی کے مختلف شراکت دار جو چار برس قبل عدلیہ کی بحالی کیلئے عوام کوسڑکوں پر لانے میں کامیاب ہوگئے تھے اِس وقت بھی عدلیہ کی ادارہ جاتی بااختیاریت اور اس کے احکامات کی تعمیل کیلئے ایک بار پھر سڑکوں پر آ کرحکومت پر دباؤ ڈالیں تو معاملات کوحل کرنے کی ایک صورت نکل سکتی ہے۔

لیکن شاید سول سوسائٹی اسوقت 2007 کی طرح منظم نہیں ہے۔اس کا بنیادی سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت ٹکراؤ ایک فوجی آمر سے تھا اس لئے سول سوسائٹی زیادہ بہتر انداز میں منظم ہوگئی تھی جبکہ آج سول سوسائٹی کے مختلف شراکت دار مختلف سیاسی ہمدردیاں رکھنے کے سبب منقسم ہیں ۔اسلئے شاید وہ ماضی کی طرح منظم ہوکرحکومت پر دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔اس کے علاوہ حزب اختلاف کی سیاسی جماعتیں بھی حکومت کے خلاف عوام کو سڑکوں پر لانے سے کتراتی رہی ہیں۔اس کے دو اسباب سمجھ میں آتے ہیں۔اول یہ کہ سیاسی جماعتوں کو خدشہ ہے کہ اگر موجودہ حکومت کے خلاف تحریک چلائی اور عوام سڑکوں پر نکل آئے تو انہیں قابو کرنا مشکل ہوجائے گا کیونکہ معاملہ صرف عدالتی بااختیاریت کی بحالی تک محدود نہیں رہ سکے گا اور بجلی کے بحران، بدامنی، مہنگائی اور بے روزگاری جیسے مسائل میں الجھے لوگوں کے جذبات میں زیادہ شدت پیدا ہوسکتی ہے۔

ممکن ہے کہ یوں 1977 سے بھی خراب صورتحال پیدا ہوجائے جسے بہانہ بنا کرفوج کو ایک بار پھر اقتدار پر قابض ہونے کا موقع مل جائے۔لہٰذا اس وقت کوئی جماعت نہیں چاہے گی کہ حالات اس قدر قابو سے باہر ہوجائیں کہ فوج غیر معینہ مدت کیلئے ملک پر قابض ہوجائے۔دوسرے فوج کی اعلیٰ قیادت بھی اس وقت کسی ایسے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہ رہی جو اس کیلئے نئی مشکلات پیدا کرنے کا سبب بن سکے۔ایک ٹیلے ویژن پروگرام میں خود عمران خان نے یہ تسلیم کیا کہ فوج نے NRO کے خلاف مقدمات کے دوران عدلیہ کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر اس نے آئین کے آرٹیکل 190 کے تحت اس سے مدد مانگی تو فوج یہ مدد فراہم نہیں کرسکے گی۔اس سے یہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے کہ فوج صرف آرٹیکل 190 کے تحت محدود پیمانے پر عدلیہ کی مدد کی بجائے حالات کے بہت زیادہ خراب ہونے کی منتظر ہتا کہ براہ راست کاروائی کرسکے جس کے اشارے مختلف ذرائع سے مل بھی رہے ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ ریاست کا ہر ادارہ کسی نہ کسی قوت کے سہارے چل رہا ہوتا ہے۔فوج کی اپنی طاقت ہے،انتظامیہ پولیس کے ذریعہ اپنی رِٹ قائم کرتی ہے جبکہ عدلیہ کی پشت پر صرف سول سوسائٹی ہوتی ہے جو اسے عدل وانصاف پر مبنی فیصلے کرنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ماضی میں عدلیہ فوجی آمروں کے آگے اس لئے سرنگوں ہوئی کہ اس کی پشت پر سول سوسائٹی کی قوت نہیں تھی۔لیکن جب سول سوسائٹی نے خود کو assert کیا تو ہم نے دیکھا کہ عدلیہ نے جرأتمندانہ فیصلے کرنا شروع کردیئے۔

اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ آئین کے آرٹیکل 190 کی اہمیت اپنی جگہ،لیکن اس نازک مرحلے پر سول سوسائٹی کو ایک بار پھر عدلیہ کی پشت پر کھڑا ہونا پڑے گا تاکہ ایک طرف جمہوریت اور جمہوری اداروں کو استحکام دیا جاسکے اور دوسری طرف ریاستی اداروں کو آئینی محدودات کے اندر رہنے کا پابند بنایا جاسکے۔ دنیا کے جمہوری ملکوں میں ریاستی اداروں کے درمیان توازن قائم رکھنے میں سول سوسائٹی کا اہم ترین کردار ہوتا ہے۔ لہٰذا سول سوسائٹی کے میدان میں نہ اترنے اور حالات کو جوں کا توں رکھنے کے نتائج خاصے مایوس کن ہوسکتے ہیں۔جب عدلیہ کو سول سوسائٹی کا سہارا نہیں ملے گا تو وہ لامحالہ فوج کی طرف دیکھے گی جس کے نتیجے میں عدلیہ کی موجودہ آزاد حیثیت جو اس نے مارچ 2007 کے بعد بنائی ہے، بری طرح متاثر ہوسکتی ہے۔

پاکستان میں عدالتی فیصلوں کی حکم عدولی کا معاملہ نظم حکمرانی کے بحران سے جڑا ہوا ہے۔نظم حکمرانی کا یہ بحران دراصل بری حکمرانی (Bad Governance) کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ Bad Governance نے ملک میں جاری اشرافیائی نظام (oligarchy) کی کوکھ سے جنم لیا ہے ۔چونکہ ملک میں مقبول ووٹ حاصل کرنے والی بیشتر جماعتیں اسی اشرافیائی نظام کا حصہ ہیں اس لئے اسے توڑنے کی بجائے مضبوط بنانے پر متفق ہیں۔انہی اشرافیائی قوتوں نے پاکستان میں ایک ایسا سیاسی ڈھانچہ ترتیب دیا ہے جس میں صرف مراعات یافتہ طبقات کے لوگ ہی اسمبلیوں میں پہنچ سکیں۔اگر کچھ حلقوں سے متوسط یا نچلے متوسط طبقے کے کچھ افراد اسمبلیوں میں پہنچ بھی جاتے ہیں،تو مقتدر اشرافیہ انہیں co-opt کرکے جاری سسٹم کا حصہ بنالیتی ہے یا پھر انہیں مسلسل دباؤ میں رکھتی ہے۔

پاکستان میں اشرافیائی نظام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے نتیجے میں ریاستی اداروں کی تباہی پر اظہار خیال کرتے ہوئے معروف سماجی دانشور تسنیم صدیقی نے گذشتہ دنوں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ قومی وسائل پر مکمل دسترس اور تمام تر ریاستی طاقت کے باوجود موجودہ اشرافیائی نظام اب عوام کو کچھ ڈیلیور کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا ہے۔انہوں نے بروکنگس انسٹی ٹیوٹ کے جوزف کوہن کا حوالہ دیا ہے، جس کا کہنا ہے کہ "ہوسکتا ہے کہ پاکستانی اشرافیہ اتنی مضبوط ہو کہ وہ ریاست کو ناکام ہونے سے بچالے لیکن اس میں اتنی طاقت اور بصیرت نہیں کہ وہ کوئی ایسی تبدیلی لائے، جو ریاست کی transformation کا سبب بن سکے۔یہی وجہ ہے کہ ریاستی انتظامی ڈھانچہ فرسودگی کی آخری حدود کو چھورہا ہے اور مستقبل قریب میں اس میں کسی قسم کی بہتری کے آثار بھی نظر نہیں آرہے۔

پاکستان کو اس وقت صرف مذہبی شدت پسندی ہی سے خطرات لاحق نہیں ہیں بلکہ فرسودہ انتظامی ڈھانچہ اور اقتدار اعلیٰ پر قابض اشرافیہ (سیاسی اور غیر سیاسی) بھی اس کا شیرازہ بکھیرنے کا سبب بنی ہوئی ہے۔لیکن جب سے عالمی اور خطے کی سطح پر دوررس تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئی ہیں، ریاستی ڈھانچے کو transform کئے بغیر پاکستان کے وجود کو قائم رکھنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔کیونکہ ان تبدیلیوں کے براہ راست اثرات پاکستان کے سماج اور سیاست پر مرتب ہورہے ہیں جن

کی وجہ سے پاکستان میں پالیسی سازی میں کلیدی تبدیلیوں کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے۔

اس سلسلے میں ماہرین عمرانیات کا کہنا ہے کہ سائنسی ایجادات کے علاوہ اطراف میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اور واقعات کسی معاشرے کی ہیئت کو تبدیل کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ جب سماج تبدیل ہوتا ہے تو طرزِ سیاست سے نظم حکمرانی تک اور سماجی اقدار سے ریاستی قوانین تک ہر اصول وضابطہ تبدیل ہوتا ہے جس کا راستہ روکنے کے منفی اثرات برآمد ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں ان حقائق کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی بجائے آج بھی سرد جنگ بلکہ نوآبادیاتی دور کی پالیسیوں کے تسلسل پر اصرار کیا جارہا ہے جس کی وجہ سے ملک کو چلانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہوتا جارہا ہے۔ لیکن مقتدر اشرافیہ یہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر ہے۔ کمشنری نظام اور پولیس ایکٹ 1861 کی بحالی اسکی واضح مثال ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ پاکستانی عوام نے سیاسی وسماجی تبدیلیوں کیلئے جدوجہد نہ کی ہو۔ پاکستان کی 64 سالہ سیاسی تاریخ میں عوام کئی بار بامقصد تبدیلی کیلئے سڑکوں پر آئے اور انہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے بھی پیش کئے۔ مگر عدلیہ کی بحالی کی تحریک کے علاوہ کوئی بھی تحریک اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچ سکی۔ اس کی بنیادی وجہ پاکستانی معاشرے اور سیاست پر اشرافیائی نظام کی مضبوط گرفت ہے۔ سیاسی جماعتیں جو اس اشرافیائی نظام کا حصہ ہیں status quo کو جاری رکھنے کیلئے ہر بار اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ساز باز کرکے عوام کے خون کا سودا کرتی آئی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان میں ریاستی ڈھانچے میں کلیدی تبدیلیوں کیلئے جب بھی عوامی تحاریک چلیں، انہیں ہر بار طاقتور ریاستی عناصر (اسٹیبلشمنٹ اور سیاسی اشرافیہ) نے ہائی جیک کرکے ان کی سمت تبدیل کردی۔ ان بااثر اور طاقتور قوتوں نے اشرافیائی نظام کے تسلسل کو جاری رکھنے کیلئے کبھی عوام کو عقیدے کی بنیاد پر تو کبھی لسانی بنیادوں پر تقسیم کرکے بامقصد تبدیلی کے راستے میں رکاوٹ ڈالی ہے۔ اسلئے موجودہ سیاسی جماعتوں سے حقیقی جمہوری معاشرے کے قیام اور اقتدار واختیار کی نچلی سطح تک منتقلی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

آج جب کہ پوری دنیا اقتدار واختیار میں فاصلے اور اختیارات کی نچلی ترین سطح تک منتقلی کی راہ پر گامزن ہے اور خود پاکستان میں الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کے پھیلاؤ اور سول سوسائٹی کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کے باعث اشرافیائی نظام لڑکھڑا رہا ہے، اسٹبلشمنٹ سیاسی اشرافیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے انتظامی ڈھانچے پر اپنی گرفت کو برقرار رکھنے اور قومی وسائل پر قابض رہنے کیلئے نوآبادیاتی دور کے قوانین اور طرز حکمرانی کا سہارا لے رہی ہے۔ 1860 کے سول سروس نظام اور 1861 کے پولیس ایکٹ کی بحالی اسی سوچ اور رویئے کو ظاہر کرتی ہے۔ تاکہ ملک میں تبدیلیوں کا راستہ روکا جاسکے۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ اس نوآبادیاتی نظام کے نفاذ کے پاکستان میں جمہوری اداروں پر کتنے منفی اثرات مرتب ہوں گے اور پہلے سے فرسودہ انتظامی ڈھانچہ مزید کتنا فرسودگی کا شکار ہوجائے گا۔ جو احباب اس بندوبست کے حق میں جواز پیش کررہے ہیں وہ شاید اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ برطانیہ جس نے برٹش انڈیا میں یہ نظام متعارف کرایا تھا، نصف صدی قبل اس نظام سے چھٹکارا پاچکا ہے۔

دوسرے برطانیہ نے پیشہ ورانہ دیانت داری کے ساتھ جس انتظامی میکنزم کے ذریعہ اس نظام کو چلایا تھا، پاکستان میں اسکا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں سول سروس DMG) اور پولیس سروس) کے اہلکاروں کا انتخاب اب میرٹ کی بجائے کوٹا سسٹم کے تحت ہوتا ہے اور ٹریننگ موڈیول بھی نوآبادیاتی ہونے کی وجہ سے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اسی لئے سول سروس کی پیشہ ورانہ اہلیت اور اس کا انتظامی ویژن گذشتہ کئی دہائیوں سے سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ سول سروس کے اہلکاروں کی اکثریت اسی اشرافیائی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے جو ریاست کے سیاہ وسپید پر حاوی ہے۔ لہٰذا ان سے عوامی مفاد میں کسی منصوبہ بندی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اسلئے یہ کہنا کسی طور پر غلط نہ ہوگا کہ سیاسی اشرافیہ اس نظام کو واپس لانے کیلئے اسلئے بے چین ہے تاکہ موجودہ status quo کو مزید کچھ عرصہ کیلئے ٹوٹنے سے بچایا جاسکے۔

جدید دنیا میں ریاستی انتظام اب دو درجاتی two tier نظام کے تحت نہیں چل رہا، بلکہ بیشتر جمہوری معاشروں میں سہ درجاتی three tier نظام رائج ہوچکا ہے۔ جو عوام کی براہ راست شرکت کی وجہ سے زیادہ جمہوری تصور کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں اس نظام کو مقامی حکومتی نظام کے ذریعہ نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس نظام میں کئی بنیادی نوعیت کے سقم پائے جاتے ہیں جنہیں دور کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس نظام میں درستگی کرنے کی بجائے اسے بیک جنبش قلم رد کرکے ایک ایسے نظام کو مروج کرنا جو پوری دنیا میں متروک ہوچکا ہے نہ صرف ناقابل فہم ہے بلکہ بددیانتی پر مبنی ہے۔

خود پیپلز پارٹی نے 1993 کے انتخابات سے قبل جو انتخابی منشور جاری کیا تھا اس میں ضلعی حکومت کے قیام کا وعدہ کیا گیا تھا بلکہ ضلع کی سطح پر گورنر تعینات کرنے کی بھی بات کی گئی تھی۔ مگر اب وہ نوآبادیاتی نظام پر محض اسلئے اصرار کررہی ہے تاکہ بُری حکمرانی کے نتیجے میں اپنی گرتی ہوئی ساکھ اور غیر مقبولیت کو اس نوآبادیاتی بندوبست کے ذریعہ سہارا دے اور اگلے انتخابات میں ڈپٹی کمشنر اور پولیس کے انسٹی ٹیوشن کی مدد سے کامیابی حاصل کرسکے۔ مسلم لیگ (ن) کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ اسے ہر اس اقدام سے چڑ ہے، جو پرویز مشرف نے متعارف کرائی ہو، خواہ اس کے کتنے ہی فوائد کیوں نہ ہوں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب اس پہلو پر غور کریں کہ پاکستان میں سیاسی اشرافیہ اور اسٹبلشمنٹ کا یہ کھیل آخر کب تک جاری رہے گا؟

اس صورتحال میں وہ دانشور حلقے اور متفکر شہری جو خلوص نیت کے ساتھ جمہوریت اور جمہوری اقدار کے استحکام کی خواہش رکھتے ہیں انہیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ برادری سسٹم، فیوڈل اثرات، قبائلی دباؤ اور انتخابی دھاندلیوں کے زیر اثر کیا موجود پارلیمانی نظام جمہوری عمل کے استحکام اور عوامی مسائل کے حل میں کوئی کردار ادا کررہا ہے یا اقتدار پر قابض اشرافیہ کو مزید مضبوط بنارہا ہے۔ یہ طے ہے کہ پاکستان کے مخصوص سماجی منظر نامے کی روشنی میں جہاں تعلیم کی شرح تشویشناک حد تک کم ہے، ایک متبادل نظام حکمرانی کی ضرورت

ہے۔ایک ایسا نظام حکمرانی جوانتظامی ڈھانچے کو جدید خطوط پراستوار کرسکے، جس میں عوامی مسائل کو pro-active انداز میں حل کرنے کی صلاحیت موجود ہواور جس میں معاشرے کی نچلی ترین سطح پر لوگوں کو ریاستی منصوبہ سازی میں شراکت کا موقع مل سکے۔البتہ انہیں اس پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ متبادل نظام کے خدوخال کیا ہوں گے۔

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ملک میں ایسی سیاسی جماعتیں ہوں جن کا قومی ترقی کے بارے میں ویژن واضح ہو اور جن میں جرأت مندانہ اقدمات کرنے کی اہلیت اور صلاحیت موجود ہو۔مقبول ووٹ لینے والی موجودہ سیاسی جماعتوں کے اندرونی ڈھانچے میں اسی وقت دراڑ پڑسکتی ہے جب کم ازکم انتخابی عمل کو تبدیل کردیا جائے۔اس حوالے سے دو آپشنز سامنے آتے ہیں جن پر غوروفکر اور مکالمے کی ضرورت ہے۔پہلا آپشن صدارتی طرز حکمرانی کا ہے جس کیلئے امریکی یافرانسیسی طرز میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔صدارتی طرز حکمرانی کی حمایت میں دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ دلائل دے رہا ہے۔گذشتہ دنوں ایک ٹیلے ویژن مذاکرے میں معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر عطاالرحمان اور سابق وزیر قانون اقبال حیدر بھی اس نظام کی تائید کرچکے ہیں۔

دوسرا آپشن متناسب نمائندگی کی بنیاد پر پارلیمان کی تشکیل ہے۔صدارتی نظام کے اس ملک میں کئی تجربات ہوچکے ہیں۔ہرفوجی آمر نے کسی نہ کسی شکل میں صدارتی نظام کی پیوندکاری کرنے کی کوشش کی۔لیکن ایوب خان نے 1962ء کے آئین کے ذریعہ اس نظام کو عملاً نافذ بھی کیا۔مگر یہ نظام زیادہ عرصہ چل نہیں سکا۔اس کے علاوہ 1973 میں متفقہ آئین کی تشکیل کے بعد صدارتی طرز حکمرانی کا نفاذ ایک مشکل اور دشوار گذار مرحلہ ہے۔کیونکہ اس نظام کے نفاذ کیلئے اول تو موجودہ آئین کو ختم کرکے ایک نئے آئین کی تشکیل کی طرف جانا ہوگا جو آج کے حالات میں ناممکن ہے۔

دوئم صدارتی نظام میں گوکہ وزارتوں کی کارکردگی کوٹیکنوکریٹس کی مدد سے بہتر بنایا جاسکے گا مگر فیوڈل اشرافیہ کو اسمبلیوں میں پہنچنے سے نہیں روکا جاسکے گا جو قانون سازی کے عمل میں پہلے ہی کی طرح رکاوٹ بنیں گے۔اسلئے اگر صدارتی نظام پر اصرار کرنے کی بجائے موجودہ متناسب نمائندگی کے نظام کا تجربہ کیا جائے تو اس کے خاصے امید افزا نتائج سامنے آسکتے ہیں۔اس نظام کیلئے موجودہ آئین کی انتخابات سے متعلق شقوں میں معمولی تبدیلی کی ضرورت ہوگی اور پورا پارلیمانی ڈھانچہ حسب سابق اسی طرح چلتا رہے گا۔یہ نظام پاکستان کے مخصوص سیاسی منظرنامے میں بہتری لانے میں اہم کردارادا کرسکتا ہے۔ اس نظام کے تحت انتخابات کرانے کی صورت میں سیاسی جماعتوں کی طرف سے فیوڈل اور علاقے کی بااثر شخصیات کو ٹکٹ دینے کا جواز ختم ہوجائے گا۔اس کے علاوہ اس نظام میں آزاد امیدواروں کیلئے بھی کوئی گنجائش نہیں ہوگی جو خرید وفروخت کا بازار گرم کرکے سیاسی عمل میں کرپشن کو بڑھانے کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ البتہ اس میں انتخابی حلقے اسی طرح موجود رہتے ہیں جس طرح کہ آج ہیں۔

اس نظام میں انتخابات کا طریقہ یہ ہے کہ ہر جماعت جتنے مقبول ووٹ حاصل کرے گی اسے اسی مناسبت سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں نشستیں تفویض کردی جائیں گی۔ ہر جماعت انتخابات سے قبل اپنے اراکین کی فہرست الیکشن کمیشن میں جمع کرائے گی اور جتنی نشستیں اس جماعت کو ملیں گیاس فہرست سے اتنے افراد منتخب قرار پائیں گے۔یہ عمل بالکل اسی طرح ہے،جیسا کہ آج کل خواتین اور اقلیتوں کی نشستوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ساتھ ہی ہر جماعت کو پابند کیا جائے کہ وہ مختلف سطحوں پر وزارتوں کیلئے شعبہ جاتی ماہرین کی ایک فہرست بھی جمع کرائیں تاکہ ان ماہرین کو اسمبلی کی رکنیت اوراکثریت حاصل کرنے کے بعد کابینہ میں شریک کیا جاسکے۔

اس طرح ایک طرف تو آزاد امیدواروں کے اسمبلیوں میں نہ پہنچ سکنے کے باعث حکومت سازی کیلئے ان کی خرید وفروخت کا سلسلہ بھی ختم ہوجائے گا۔جبکہ دوسری طرف اسمبلی میں وہی لوگ آسکیں گے جن میں قانون سازی کی اہلیت اور دلچسپی ہوگی۔ پاکستان جیسے معاشرے میں جہاں تعلیم کی شرح بہت کم ہے، جمہوری اداروں کی تشکیل اور اچھی حکمرانی کیلئے اس نظام کا تجربہ بہت ضروری ہے۔اسی نظام کے ذریعہ پیشتینی سیاست اور کسی مخصوص وزارت پر غیر متعلقہ فرد کے وزیر بنائے جانے کے امکانات کم کئے جاسکتے ہیں۔اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جس شخص کو یہ نہیں معلوم کہ انجن کا رخ کس طرف ہوتا ہے، وہ وزیر ریلوے ہوتا ہے۔ جسے سب سے زیادہ امراض لاحق ہوں،وہ وزارت صحت کا حقدار ٹھہرتا ہے اور جسے قانون کی ابجد سے بھی واقفیت نہ ہو،وہ وزیر قانون قرار پاتا ہے۔

اسی طرح اسپتالوں کا انتظام اور نگہداشت بھی ضلع کی ذمہ داری ہو جبکہ منصوبہ بندی صوبہ کرے۔شہری ترقی، بلڈنگ کنٹرول اور فراہمی ونکاسی آب ضلع کی ذمہ داری ہو۔پولیس مکمل طور پر مقامی ہو،جس کا تقرر بھی ضلعی انتظامیہ کرے اور پولیس کمشنر ضلع ناظم کو جوابدہ ہو۔ضلع کی سطح پر تقرریوں کو شفاف بنانے کیلئے ڈسٹرکٹ سروسز کمیشن تشکیل دیا جاسکتا ہے جو ضلعی سطح پر بیوروکریسی کا انتخاب اور اس کی تربیت کا اہتمام کرسکے۔ یہ کمیشن مختلف محکموں کے عہدیداروں، پولیس میں انسپکٹر کی سطح تک کے اہلکاروں کے علاوہ اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے اساتذہ کی بھرتی کرنے کا ذمہ دار ہو۔اعلیٰ عہدوں کیلئے صوبائی سروسز کمیشن ہو لیکن وفاق میں کوئی تقرری براہ راست نہ ہو بلکہ وفاق صوبوں سے حسب ضرورت اہلکاراور افسران کو میرٹ پر حاصل کرکے ان کی مطلوبہ شعبہ جات میں ازسرنو تربیت کرکے تعینات کرے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ منظرنامے میں جب تک متناسب نمائندگی اور انتظامی ڈھانچے کو تین درجاتی شکل میں منظم نہیں کیا جاتا، معاملات اسی طرح دگرگوں رہیں گے۔نااہل وزرا اسی طرح لوٹ کھسوٹ کرتے رہیں گے اور حالات سے تنگ آئے عوام اسی طرح ہر چند برس بعد تنگ آکر فوج کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوتے رہیں گے۔اسلئے فرسودگی کے شکار نظام پر اصرار کرنے کی بجائے بہتری کیلئے اصلاحات کا راستہ اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔

☆☆☆☆☆

پاکستان، عالمی صورتحال اور سامراج

امیر حمزہ ورک

یورپی صنعتی انقلاب کے بعد تاریخ عالم میں دو عالمی جنگیں، سوویت یونین کا ظہور اور اسکی پسپائی، سرد جنگ کا خاتمہ دوررس نتائج کے حامل ہیں۔ دو عالمی جنگوں میں سرمایہ دار یورپی ممالک بشمول جاپان اور امریکہ بیرونی منڈیوں پر اپنے تسلط کیلئے برسرپیکار تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ (45-1939) کے بعد سامراجی ملکوں نے اپنے مشترکہ دشمن سوویت یونین، قومی آزادی کی تحریکات اور طبقاتی جدوجہد کے خلاف گھیراؤ اور محاذ آرائی کے لئے باہمی رقابت ترک کر کے معاونت اور رفاقت کا رویہ اختیار کیا اس سے مشرق۔ مغرب کی کشمکش کی ابتدا ہوئی جسے سرد جنگ کا نام دیا گیا تھا۔

اس حکمت علمی کے دورخ تھے۔ سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک وسامراج مخالف ممالک کے خلاف معاوندانہ روش اور سامراجی ملکوں کے مابین اقتصادی، سیاسی اور فوجی تعلقات کا نیا دور جس کا بنیادی مقصد تیسری دنیا پر سامراجیوں کا اقتصادی اور تجارتی تسلط تھا چالیس سال بعد (85-1945) صورتحال تبدیل ہوگئی۔ 1985 میں سوویت یونین کا سوشلسٹ کردار تبدیل ہوگیا اور سرد جنگ کا خاتمہ بھی۔ اگرچہ سامراجی ملکوں کے مابین متعدد امور میں اشتراک عمل جاری رہا مگر امریکہ نے خود کو واحد سپر پاور ہونے کے نشے میں من مانی شروع کی جس کی وجہ سے ان کے مابین رنجش اور تضادات پیدا ہونے لگے مگر ان کی راہیں جدا نہ ہوئیں امریکہ نے اپنی اقتصادی اور عسکری قوت کے بل بوتے اپنی یکطرفہ کاروائی کا آغاز کیا حالانکہ سرد جنگ کے بعد امریکہ اور اس کے مغربی ہمنوا ممالک نے یہ تشہیر کی کہ دنیا جنگ وجدل سے پاک ہوگئی ہے۔ ابھی عملاً سوویت یونین اپنی زندگی کی آخری ہچکی ہی لے رہا تھا کہ کویت پر عراق کے حملہ کی آڑ میں تمام سامراجی ملکوں، مشرق وسطی کے تمام سامراج نواز، حکومتوں اور متعدد ترقی پذیر ممالک نے عراق پر امریکی فوجی یلغار کی حمایت کی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا زیادہ غیر مستحکم ہوگئی ہے اور سامراجیوں خصوصاً امریکہ کو غلبہ حاصل ہوا جو ہنوز جاری ہے۔

سامراجیوں نے اپنی برتری کے لئے عالمی اقتصادی میدان میں عالمی تجارتی تنظیم (WTO) کے ذریعہ سرحدوں سے ماورا (Border Free) آزاد تجارت کا جال پھیلایا جس کا مقصد ایک طرف منڈی کی مسابقت (Competition) کی آڑ میں ترقی پذیر ممالک کی صنعت وتجارت کو مفلوج کرنا اور ان کی وسیع منڈیوں پر تسلط کا حصول تھا۔ سرد جنگ کے دوران، سوشلسٹ کیمپ کی موجودگی میں سامراجی طاقتیں دنیا کی اقتصادیات پر مکمل کنٹرول کرنے میں ناکام رہیں بعدازاں انہوں نے WTO کی وساطت سے اپنا حدف پورا کیا ہے ترقی پذیر ملکوں اور قوموں کی زبوں حالی اور ان کی عالمی تجارت مین مزید عدم توازن اس کا ثبوت ہے۔

سیاسی داؤ پیچ اور فوجی جارحیت دراصل معیشت اور تجارت کے حربے ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے قبل بیرونی منڈیوں پر براہ راست قبضے کے لئے جنگ وجدل کا بازار گرم کیا جاتا تھا۔ اب سامراجیوں کے پاس ایک اور ہتھیار کا اضافہ ہوگیا ہے جس کا نام WTO ہے اس کے علاوہ عالمی بنک آئی۔ ایم۔ ایف۔ (عالمی مالیاتی فنڈ) اضافی ہتھیار ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی معیشت اور اپنے تجارتی تسلط قائم کرتے ہیں۔ جو کام WTO، عالمی بینک اور آئی ایم ایف نہیں کر سکتے، امریکہ اپنی یکطرفہ فوجی کاروائی کے ذریعے پورا کر لیتا ہے۔

عراق کی فوجی قوت کے خاتمے اور عراقی تیل کے ذخائر پر قبضہ کیلئے امریکہ کو جب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے اجازت نہ ملی تو اس نے عالمی ادارہ کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے عراق پر فوج کشی کی جس کے لئے اس نے یہ شور برپا کیا تھا کہ عراق کے پاس بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار (WMDs) موجود ہیں۔ اس سے قبل 1991 میں کویت کے مسئلہ پر خلیج کے بعد عراق پر اقوام متحدہ نے تجارتی پابندی عائد کی تھیں جن کے نتیجہ میں لاکھوں لوگ، بچے اور بوڑھے غذا کی قلت اور بیماریوں سے لقمہ اجل بنادیئے گئے عراق کی دوسری جنگ میں لاکھوں لوگ ہلاک وزخمی ہوئے۔ عراق کی اقتصادی اور فوجی قوت بشمول قومی یکجہتی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے عراق کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔

اس سے قبل افغانستان سے متعلق اقوام متحدہ کی قرارداد کی ایما پر نیٹو کی فوج نے حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ افغانستان میں قائم طالبان کی حکومت پر بہتان لگایا گیا کہ افغانستان میں موجود القاعدہ کے دہشت گردوں نے 11 ستمبر کی نیویارک اور واشنگٹن میں تباہ کاریاں کیں حالانکہ اس الزام کا آج تک کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہ کیا جاسکا۔ ان گزرے واقعات کی یاددہانی کا مدعا یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے سامراجی حلیف سرد جنگ کے بعد مواقع کے اعتبار سے کیا کیا حکمت عملیاں تیار کرتے ہیں۔

خود کو ساری دنیا کا ٹھیکیدار مقرر کرتے ہوئے امریکہ ہر اس ملک کو دنیا کیلئے خطرناک سمجھتا ہے جو امریکی وسامراجی حکمت عملی سے گریزاں ہوتا ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایران ایک ایسا ملک ہے جو 1979 سے اپنی آزاد خارجہ پالیسی پر گامزن ہے اور امریکی دھمکیوں اور رعب کی کوئی پروا نہیں کرتا ایران کے خلاف سامراجیوں کا یہ پروپیگنڈا تھا کہ یہ بنیاد پرست اسلامی ملک ہے جس سے علاقہ اور امریکہ کو خطرہ ہے لیکن جب سے ایران نے پرامن مقاصد کیلئے ایٹمی پروگرام شروع کیا ہے، امریکہ متواتر یہ قیامت خیز منظر پیش کرتا رہا ہے کہ ایران جوہری ہتھیار بنا رہا ہے اور ساری دنیا خصوصاً امریکہ اسکی زد میں ہے۔ اس پروپیگنڈا کو جھوٹ اور حماقت کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ ایران بارہا یہ کہہ چکا ہے کہ اس کا نیوکلیائی پروگرام پرامن مقاصد کیلئے ہے لیکن امریکہ بضد ہے کہ اسے ایٹمی پروگرام سے باز رکھنے کیلئے اس پر یلغار کی جائے۔ بش انتظامیہ کے طویل المیعاد پروگرام میں مشرق وسطی بشمول ایران کے تیل کے ذخائر پر قبضہ بھی شامل تھا۔ ایران کے خلاف یہ شور وغوغہ اس مقصد کا حصہ تھا۔ اس سلسلے میں چونکہ WTO اور عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے ضابطے کارگر نہیں ہوسکتے اس لئے واشنگٹن کے نزدیک ایران پر واحد راستہ (Option) فوج کشی ہے اور اس

حکمت عملی پر گامزن تھا۔جبکہ صدر اوبامہ انتظامیہ ایران سے بظاہر مذاکرات کی حامی نظر آتی ہے اگر ایران نے امریکی پلان سے اتفاق نہ کیا تو ایران کے خلاف امریکی انتظامیہ کی معاندانہ پالیسی خارج از امکان بھی نہیں۔

دوسرے ملکوں کے قدرتی وسائل اور اسٹرٹیجک پوزیشن پر اپنے کنٹرول کے لئے امریکہ ان ملکوں کے خلاف بھی اقدام اٹھانا چاہتا ہے جو امریکی برتری کو تسلیم نہیں کرتے یا امریکی حکمت عملی کیلئے سدراہ ہیں اس ضمن میں چین اور روس امریکہ کے نزدیک رکاوٹ ہیں جن کی سرکوبی کیلئے امریکہ مختلف جتن کرتا رہا ہے۔امریکہ اور اس کے مغربی حواری ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ ہر ملک کو اپنی آزاد معیشت کیلئے کھلی چھٹی ہے اور علاقائی معاونت کو فروغ دینے کا حق ہے لیکن دوسری طرف وہ ان باتوں کی خود ہی نفی کرتے ہیں۔امریکہ یہ نہیں چاہتا کہ مشرقی ایشیاء، جنوبی ایشیا اور وسط ایشیا میں چین سے اقتصادی اور سیاسی تعلقات استوار ہوں اور اس کا اثر ورسوخ بڑھے۔حالانکہ چین بہت حد تک آزاد معیشت پر کاربند ہے اور ان ہی علاقوں سے جڑا ہوا ہے چین کے ان اقتصادی اور خوشگوار سفارتی تعلقات سے علاقوں میں تجارتی فروغ اور پرامن فضا کو تقویت حاصل ہوگی جو عالمی امن اور استحکام کیلئے نیک شگون ہے۔لیکن امریکی سامراجی عزائم ایسے پراگندہ ہیں کہ بشن انتظامیہ کو امن وآشتی، بھائی چارہ کا ماحول پسند نہیں تھا۔اس کے علاوہ امریکہ چین کے ابھرتی ہوئی اقتصادی اور فوجی طاقت سے اسلئے خائف ہے کہ اسے آئندہ برسوں میں یکطرفہ کاروائی کے مواقع نہیں ملیں گے جو امن عالم اور استحکام کیلئے اہمیت کا حامل ہے۔پرانی کہاوت ہے کہ ہاتھی مرنے کے بعد بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔سوویت یونین کے خاتمے کے بعد گو کہ روس سپر پاور نہ رہا مگر اس کے رقبہ کا حجم، فوجی حیثیت اور اسکی قدرتی وسائل اور معیشت کی وجہ سے وہ دنیا کا ایک اہم ملک ہے۔

امریکہ مشرقی یورپ کے معدنی ذخائر اور فوجی اہمت کے حامل مقامات کو اپنے تصرف میں رکھنے کا خواب دیکھ رہا ہے مشرق کی جانب پیش قدمی کا امریکی نظریہ اس کنٹرول کے خاکے کا عنوان ہے۔سابق روسی صدر یلسن کے نظریئے کے برعکس روسی وزیراعظم پوٹن نے جو امریکہ مخالف روس کی علاقائی وعالمی اہمیت کی پالیسی وضع کی تھی موجودہ روسی قیادت اس حکمت عملی پر قائم ہے۔

روس۔چین تعلقات نے روس کو مزید مضبوط اور اہم بنادیا ہے مگر امریکہ خود ساختہ یک قطبی دنیا کا محور ہونے کی حیثیت سے ساری دنیا پر اپنے تسلط کا حق تصور کرتا ہے روس کی سرحدوں کے قریب مشرقی یورپ میں ماسکو، امریکی فوج کی پیش قدمی برداشت نہیں کریگا۔روس چین محور میں دوسرے ممالک کا اضافہ ہوگا اور امریکہ کے خلاف ایک نئے اقتصادی اور فوجی بلاک بھی ظہور پذیر ہونے کے آثار رونما ہورہے ہیں جب ساری انسانی تاریخ میں کوئی واحد سپر پاور نہیں رہا تو امریکہ کیسے واحد سپر پاور بن جائیگا۔امریکہ کا خواب جدلیاتی قانون کے برعکس ہے۔

شمالی کوریا:

بحرالکاہل کے مشرق بعید میں واقع عوامی جمہوریہ کوریا (DPRK) یا شمالی کوریا، جو روسی اور چینی سرحدوں پر واقع ہے، امریکہ کیلئے ناپسندیدہ ملک ہے کیونکہ وہ پاکستان اور اس جیسا کوئی سامراجی طفیلی ملک نہیں ہے۔وہ ترقی پذیر اور چھوٹا ہوتے ہوئے بھی ایک آزاد اور خودمختار ملک ہے۔شمالی کوریا کے خلاف امریکہ کے معاندانہ رویہ کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک سوشلسٹ ملک ہے اور امریکہ کی دھونس دھاندلیوں میں نہیں آتا۔امریکہ کی شمالی کوریا سے محاذ آرائی صرف دو نکات کی بنا پر ہے۔اس کے طرزِ معاشرت میں تبدیلی کے ساتھ استحصالی نظام کی بحالی اور اس کے وسائل اور اسٹرٹیجک حیثیت پر قبضہ۔امریکہ اس چھوٹے ملک سے بھی خوفزدہ ہونے کا پروپیگنڈا کرتا ہے۔

جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں میں خوف طاری کرنے کے علاوہ امریکہ نے جنوبی کوریا میں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس چالیس ہزار نفری پر مشتمل امریکی فوج تعینات کی ہوئی ہے جس کا مقصد بھی شمالی کوریا کو بوقت ضرورت نشانہ بنانا ہے۔اس امریکی حکمت عملی کے تدارک کی غرض سے شمالی کوریا نے ابتدائی مراحل میں ایٹمی پاور پلانٹ بنایا ہے جس کا مقصد سستے داموں بجلی کا حصول ہے۔بعد ازاں اس نے خود کو امریکی جارحیت سے محفوظ رکھنے کیلئے نیوکلائی ہتھیار کی ضرورت محسوس کی اور جوہری ہتھیار بنانے کے تجربے کے لئے مجبور ہوا۔امریکہ اور اس کے حلیف جاپان اور جنوبی کوریا نے یہ واویلا کیا کہ نہ صرف تینوں کو بلکہ پورے خطے کو ایٹمی تباہی کا خطرہ ہے حالانکہ جاپان کے جزیروں میں امریکی فوج جدید ہتھیاروں سے لیس ہے۔شمالی کوریا کا ایٹمی ہتھیاروں کا پروگرام محض امریکی جارحیت کی روک تھام کے سوا کچھ نہ تھا۔اس سے قبل امریکہ نے شمالی کوریا کو اس کے ایٹمی پلانٹ بند کرنے کیلئے مفت ایندھن کی فراہمی کا وعدہ کیا تھا جو کبھی پورا نہ ہوا۔

بہرحال نئے معاہدہ کے تحت عوامی جمہوریہ کوریا نے ایٹمی ہتھیار کی تیار کا منصوبہ اس شرط کے ساتھ ترک کیا کہ اسے بجلی کی پیداوار کیلئے ایندھن فراہم کیا جائے جنوبی کوریا نے یہ معاہدہ طے کیا۔اب دیکھنا ہے کہ امریکہ کیا رویہ اختیار کرتا ہے تاکہ یہ معاہدہ منسوخ نہ ہو۔

لاطینی امریکہ:

کل تک عوامی جمہوریہ کیوبا لاطینی امریکہ میں واحد سوشلسٹ ملک تھا جو تن وتنہا امریکی توسیع پسندی اور جارحیت کے خلاف برسرپیکار تھا اور امریکہ نت نئے عنوان سے اسے مغلوب کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا ہے۔اب وینزویلا اور بولیویا کے علاوہ پیرو، نکاراگوا، میکسیکو، کولمبیا اور چلی کے عوام کی بھاری اکثریت نہ صرف امریکہ مخالف ہے بلکہ اپنے سماجی نظام کی تبدیلی کیلئے جدوجہد کررہے ہیں۔کولمبیا میں استحصال سے پاک نظام کی مسلسل جدوجہد جاری ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لاطینی امریکہ ازسرنو 20ویں صدی کی 60ء70ء کی دھائی کا سامراج مخالف جمہوری جدوجہد کی صف بندی کررہا ہے۔

عراق اور افغانستان میں امریکی ناکامی:

عراق اور افغانستان میں امریکی فوجی حکمتِ عملی مکمل طور پر ناکام ہوچکی ہے اب خود امریکی، تجزیہ نگار یہ اعتراف کررہے ہیں کہ بش انتظامیہ کا فوجی نظریہ ناکام ہوگیا ہے۔حتیٰ کہ ری پبلکن پارٹی اور ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنماؤں نے اس کی تصدیق کردی ہے کہ فوجی آپریشن ناکام ہیں امریکی صدارتی انتخاب کے بعد عراق سے فوجی انخلاء شروع ہونے

کی بات کی جارہی ہے ۔تاہم متواتر اپنی فوجی حزیمت کے باوجود افغانستان سے فوجی انخلاء کیلئے امریکی حکمراں جس میں دونوں پارٹیاں شامل ہیں آمادہ نظر نہیں آتے ۔

افغانستان پر امریکی تسلط کے حق میں اس وقت امریکہ ہے کیونکہ افغانستان امریکہ کیلئے وسط ایشیاء اور مشرقی یورپ میں داخلے کا پہلا پڑاؤ ہے ۔وسط ایشیا اور مشرق یورپ امریکہ کیلئے اہمیت رکھتے ہیں ۔اسکی نظر وسط ایشیا اور مشرقی یورپ کے قدرتی وسائل کے علاوہ اسٹرٹیجک پوزیشن پر ہے ۔

امریکہ کی بظاہر اس سے الگ مگر جڑی ہوئی حکمت عملی یہ ہے کہ افغان سرحدوں سے ملحق پاکستان کے قبائلی علاقوں (فاٹا) میں موجود القاعدہ اور طالبان کے دہشت گردوں کی سرکوبی کے بہانے اپنی فوج تعینات کردے ۔اس علاقہ میں دہشت گردی کے واقعات پر امریکہ کی بر بار دھمکی دی کہ وہ اپنی سلامیت کیلئے یہاں اپنی فوج اتار سکتا ہے یا فوجی کاروائی کرسکتا ہے اس سے امریکہ کے جارحانہ عزائم کی عکاسی ہوتی ہے ۔

افغانستان میں ناٹو کی فوج اندرونی مزاحمت کو ختم کرنے میں برطرح ناکام ہے لیکن اپنی نالائقی اور ناکامی کا چھپانے کیلئے نیٹو فوج اور وائٹ ہاؤس کے ترجمان یہ الزام عائد کررہے ہیں کہ سرزمین پاکستان سے افغانستان میں دہشت گردوں کی مداخلت ہوتی ہے اور وہ اندرونِ افغانستان دہشت گرد کاروائیاں کرتے ہیں ۔سوال یہ ہے کہ نیٹو کے فوجیوں کے کیا فرائض ہیں دراصل باہر سے ہونیوالی تخریبی کاروائی کی روک تھام میں افغانستان میں تعینات نیٹو فوج بالکل ناکام ہیں ۔سب سے بڑا دہشت گرد خود امریکہ ہے جس نے افغانستان پر قبضہ کرلیا ہے اور جس کے خلاف مزاحمت ہورہی ہے خواہ اسکی کوئی شکل ہو ۔

امریکہ کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ وہ گریٹ گیم (Great Game) کی اسکیم پر کام کررہا ہے جس کا اجمالی تذکرہ ہوچکا ہے ۔پاکستان میں امریکی فوجی کی موجودگی کا دوسرا رخ یہ ہے کہ امریکہ بتدریج علاقہ کو اپنی فوجی گرفت میں لینے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے پاکستان کے نیوکلیائی اثاثے پر ہلا بولنا ہے اس اسلسلے میں اسکا عذر لنگ یہ ہے کہ اسامہ بن لادن کے دہشت گرد ان ہتھیاروں پر قبضہ کرنے کی جستجو میں ہیں ۔ مغربی اقوام دنیا کو یہ تاثر دے رہی ہیں کہ اگر القاعدہ یا طالبان نے پاکستان کے ایٹمی اثاثے پر قبضہ کرلیا تو اس علاقے کے علاوہ امریکی اور ساری دنیا کو ایٹمی تباہی کا خطرہ ہے ۔جرمنی نازی کے گوئبل کا قول ہے کہ اتنا جھوٹ بولو کہ اس پر سچ کا گمان ہوجائے ۔امریکہ نے یہ بہانا بنایا کہ عراق میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے مہلک ہتھیار ہیں اور امریکہ جمہوریت نافذ کرنے کی غرض سے اس پر قابض ہے ۔آج کے جنوبی اور بنیاد پرست دہشت گرد گذشتہ کل امریکہ کے ہی پروردہ تھے ۔ان کی تربیت اور مالی امداد امریکی سی آئی اے اور پاکستان کی بدنام زمانہ آئی ایس آئی نے ہی فراہم کی تھی ۔اب تو مشرق وسطیٰ ،پاکستان اور افغانستان میں دہشت گردی کے جرائم سابق امریکی صدر بش سینئر جارج بش پر عائد کیا جانا چاہئے اور عالمی عدالت میں اس پر مقدمہ چلنا چاہئے ۔

بہرحال ،امریکہ کا یہ خوف کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے پر دہشت گرد قبضہ کرینگے حقیقت کے منافی ہے ۔جس فوجی ادارے نے اتنا بڑا اٹاسک پورا کیا وہی ان کی حفاظت کی ذمہ دار بھی ہونگے ۔ایٹم بم کوئی کھلونا نہیں کہ کسی کا جب جی چاہے اسے استعمال کرے ۔ دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ القاعدہ اور طالبان کے خاتمے سے کیا امریکی جارحیت اور تسلط کے خلاف مظلوم اور محکوم عوام کی تحریک مزاحمت ختم ہوجائیگی ؟عراق اور افغانستان میں امریکی اور نیٹو فوج کی تعیناتی سے وہاں مزاحمت ختم نہیں ہوئی اور نہ ہوگی ۔اگر امریکہ نے پاکستان میں اپنی فوج اتارنے ،ایٹمی اثاثے پر قبضہ جمانے اور پاکستان کے عوام کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی مزید حماقت کی تو اسے ذلت ،شکست اور رسوائی کے سوائے کچھ نہیں ملے گا ۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ مقتدر طبقات اور اہل دانش اپنی آزادی کی تاریخ بھول گئے ہیں شمالی امریکہ میں آباد سابق نوآبادکاروں نے جب برطانیہ سے اپنی آزادی کیلئے جدوجہد کی تو اسے تمام دشواریوں اور قربانیوں کے بعد آزادی نصیب ہوئی اور برطانوی استعمار کو شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا اور راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔کیا آزادی کا یہ جذبہ صرف امریکیوں تک محدود ہے ؟جس شکست وذلت سے برطانیہ کے آباواجداد کو گزرنا پڑا تھا ،اسی سے آج کے امریکیوں کو گزرنا پڑے گا ۔اگر امریکی حکمرانوں نے موجودہ جارحیت اور تسط کی پالیسی تبدیل نہیں کی تو بقول برطانوی مورخ ارنلڈ ٹوئنبی ''تاریخ کا سبق یہ ہے کہ کوئی تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتا''

چین کا گھیراؤ:

عوامی جمہوریہ چین کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کو لگام دینے کیلئے امریکی انتظامیہ جنوبی ایشیا میں بہت الرٹ ہے ۔چنانچہ جب سے بلوچستان کے ساحل گوادار میں چین کے مالی اور فنی تعاون ومدد سے مختلف نوع کے میگا پروجیکٹ کا آغاز ہوا ہے ،سیاسی لحاظ سے بلوچستان شورش کی زد میں ہے ۔اگرچہ بلوچ قوم اپنے قومی حقوق اور اپنا قدرتی وسائل پر اپنے تصرف کیلئے جدوجہد کرتے رہے ہیں جو ان کا قابل تنسیخ حق ہے ،یہ عجب اتفاق ہے کہ ان کی جدوجہد میں شدت اور دہشت کا عنصر شامل ہوگیا ہے ۔

بلوچستان:

بلوچستان کا محل وقوع واقتصادی اور فوجی نقطہ نظر سے بہت اہمیت رکھتا ہے اس کا کچھ حصہ بحیرہ عرب سے ملتا ہے جو خلیج فارس سے جڑا ہوا ہے ۔خلیج فارس صدیوں سے تجارت اور مذہبی مشن کی گزرگاہ رہا ہے ۔مشرق وسطیٰ میں تیل کی دریافت کے بعد خلیج تجارت اور تصادم کی آماج گاہ بن گئی ۔آمدورفت کے نقطہ نظر سے یہ بہت حساس علاقہ ہے ۔بلوچستان خود کئی قدرتی وسائل کا صوبہ ہے جس میں تیل ،گیس اور مختلف قسم کی قیمتی معدنیات بشمول سونا ،تانبا اور یورینیم ہیں ۔ان خصوصیات کے سبب بلوچستان کی علاقائی اور فوجی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ۔

بلوچستان پر پاکستان کی فوج کشی کے بعد امریکہ نے بلوچستان میں دلچسپی لینا شروع کیا ۔شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر بلوچستان پاکستان سے علیحدہ ہوا تو ایران اس پر قبضہ کرلیگا ۔اس زمانے ایران مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا اڈا تھا ۔کیا وہ امریکہ کی مرضی کے خلاف ایسا قدم اُٹھا

سکتا تھا؟امریکہ نے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ کی کہ وہ ہندوستان، پاکستان، سری لنکا کی قیادتوں کے خاتمے کے مسائل میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔جبکہ براعظم افریقہ کے کئی ملکوں میں خانہ جنگی کے ساتھ مختلف فوجی محاذ آرائی بھی زور شور پر تھی۔

بحرحال، جب کبھی سینڈک پروجیکٹ پر چینی ماہرین مامور کئے گئے تو وہاں ان کی ہلاکتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔یہ کون لوگ ہیں اور کس کے ایما پر یہ سب کیا جارہا ہے یہ کوئی معمہ نہیں ۔عالمی وعلاقائی سیاست پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اصل محرکات کیا ہیں ۔گوادر میں میگا پروجیکٹ پر بلوچوں کے اپنے جائز تحفظات سے قطع نظر امریکہ کے لئے علاقائی حکمت عملی کے تناظر میں یہ ناقابل برداشت ہے۔بحرعرب کے ساحل پر واقع گوادر میں چین کی مدد اور تعاون سے میگا پروجیکٹ جب پائے تکمیل کو پہنچے گا تو وہ عالمی تجارت کا اہم مرکز بنے گا۔دبئی صرف تیل کے سبب اس وقت آزاد بندرگاہ کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ اس کے برعکس گوادر پاکستان کے 17 کروڑ اور افغانستان کے دو ڈھائی کروڑ عوام کی آبادی کی ضروریات پوری کرسکتا ہے ۔اس کے علاوہ سینٹرل ایشیا، چین اور روس کے لئے بھی یہ ایک تجارتی بندرگاہ بن سکتا ہے۔اس کے علاوہ پاکستان کی زراعت اور سندھ وبلوچستان کے تیل کے پوشیدہ چشمے اور معدنیات وغیرہ دبئی کی تجارتی حیثیت سے بھی آگے بڑھ سکتی ہے بشرطیکہ خلوص اور نیک نیتی سے گوادر پروجیکٹ پر کام کیا جائے ۔پاکستان کے اقتصادی فوائد کے علاوہ چین کا اپنا کردار بھی ہوگا۔امریکہ کیا خاموش تماشائی بنا رہے گا؟

چین کے بارے میں یہ پیش گوئی کی جارہی ہے کہ 20-25 سال بعد یہ دنیا کا سب سے بڑا اقتصادی اور فوجی پاور بن کر اُبھرے گا۔جب کسی ملک کی معیشت کا حجم فوجی ضروریات سے کئی گناہ زیادہ بڑھ جاتا ہے تو اس کی حفاظت کے لئے ڈپلومیسی کے علاوہ فوجی قوت کی ضرورت بھی درکار ہوتی ہے ۔فطری طور پر اُبھرتی ہوئی طاقت کو روکنا یوں تو دشوار طلب کام ہے مگر متحارب طاقت اسے برداشت نہیں کرتی اور نہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے محض تماشائی رہتی ہے بلکہ اپنی بقا اور اپنی برتری کے لئے رکاوٹیں ضرور کھڑی کرتی ہے امریکہ اس منصوبے پر عمل پیرا ہے۔

امریکہ سے تمام وفاداری اور فرمانبرداری کے باوجود ،پاکستان اور چین کے گہرے تعلقات رہے ہیں اور علاقہ میں دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے امریکہ کے اپنے عالمی اور علاقائی تقاضے ہیں اگر واشنگٹن ،اسلام آباد کو یہ مجبور کرنے میں ناکام رہتا ہے کہ چین گودار پروجیکٹ سے اپنا بوریا بستر گول کرلے تو امریکہ کے پاس ترپ کا کیا پتہ رہ جاتا ہے۔سامراج اپنے مفادات کے لئے ملکوں کو توڑنا اور نئے ملک بناتا رہا ہے۔کیا امریکہ بلوچستان کے لئے اس قسم کا نقشہ بنا رہا ہے؟یہ تو آنے والے وقت ہی بتائے گا مگر ہمارے حکمران اب تسلیم کرنے لگے ہیں کہ پاکستان کو بلوچستان کی علیحدگی کا خطرہ ہے۔اس خطرہ کو روکنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بلوچ رہنماؤں سے معنی اور نتیجہ خیز مذاکرات کئے جائیں ۔مذاکرات اس صورت میں کامیاب ہوسکتے ہیں کہ ان کے جائز مطالبات کو خوش اسلوبی سے طے کیا جائے ۔اگر جنرل یحییٰ خان کی فوجی حکومت نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اسلام آباد میں قیدی بنا کر رکھنے اور مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کرنے کے بجائے شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کے دوسرے رہنماؤں سے مذاکرات کئے ہوتے اور ان کے جائز مطالبات مان لئے ہوتے نہ ملک کا وہ حصہ علیحدہ ہوتا اور نہ ہندوستان کے ہاتھوں پاکستان کی ذلت آمیز شکست ہوتی ۔اگر اصل حکمراں ،فوجی جرنیلوں نے حسب دستور اپنے عوام پر فوج کشی کا پرانا وطیرہ رکھا اور صوبے کے حقوق نہ بحال کئے تو بلوچستان کی علیحدگی کی راہ ہموار ہوگی اور امریکہ اپنے مفاد کے لئے پاکستان کی سالمیت کے خلاف اپنا مکروہ رول ادا کرسکتا ہے ۔اس کے ساتھ ہی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ امریکہ بہرحال بلوچوں کا خیر خواہ نہیں ہے۔

مشرق وسطیٰ:

مشرق وسطیٰ میں ایران ،شام ،فلسطین اور لبنان کے مزاحمتی گروپوں کے سوا کوئی ملک سامراج مخالف نظر نہیں آتا ۔مصر تو 29 سال قبل سامراج مخالف عرب قوم پرستی کا جھنڈا چھوڑ کر سامراجیوں کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہوگیا تھا۔جبکہ عراق پر امریکی سامراجی تسلط اور وہاں مذہبی فرقہ وارانہ اور نسل پرستی کی بنیاد پر تقسیم نے ماضی قریب میں عراق کے سابقہ سامراج مخالف کردار کو ختم کرکے رکھ دیا ہے۔سترہ سال قبل طے پائے جانے والے اسرائیل ۔پی ایل او معاہدہ کے تحت نہ فلسطینیوں کو آزادی نصیب ہوئی اور نہ پی ایل او کا کردار برقرار رہا۔پی ایل او کی جگہ حماس مذہبی بنیاد پر اسرائیل کی مخالفت کررہی ہے اور اب یہ حماس فلسطینیوں کی منتخب نمائندہ تنظیم ہے حالیہ اسرائیل کے ساتھ مذاکرات سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ حماس نے اسرائیل کو تسلیم کرلیا ہے یا کرنے والی ہے المیہ یہ ہے کہ طویل جدوجہد کرنے والی پی ایل او (تنظیم آزادی فلسطین) امریکہ اور اسرائیل کی مخالفت کرنے کے بجائے حماس سے لڑائی لڑتی ہے۔امریکہ اب پی ایل او کو لبرل سیاسی قوت مانتا ہے جس سے پی ایل او میں رونما ہونے والی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے کہ اس کا اصل حریف کون ہے۔

دوسری طرف حماس اسرائیل کی اس لئے مخالفت کرتا ہے کہ یہ یہودیوں کی ریاست ہے جدید ریاست میں مذہب کا کوئی مقام نہیں ۔ریاست کی بنیاد جغرافیہ، تاریخ ،زبان اور ثقافت پر قائم ہوتی ہے۔سامراجیوں نے اپنی حکمت عملی کے تحت اسرائیلی ریاست کی بنیاد صہونیت پر رکھی تاکہ عرب قوم اسے سیاسی حوالے سے نہیں بلکہ متصبانہ زاویئے سے دیکھے اور سامراجیوں کی چال لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے ۔اسرائیل دراصل سامراجیوں کی پولیس والی چوکی کا فریضہ انجام دیتا ہے اور ان کے اقتصادی ،سیاسی اور فوجی مفادات کا نگہبان ہے ۔سامراج نوازی کے باوجود سعودی عرب ،اردن ،مصر اور خلیج کی ریاستوں کے فرمانروا فلسطینیوں کی آزاد اور علیحدہ ریاست بنانے میں ہنوز ناکام ہیں ۔اس وقت شام واحد عرب ملک ہے جو سامراجی حوالے سے اسرائیل کی مخالفت کرتا ہے عالمی معیشت میں تیل کی اہمیت کی حامل خلیج ریاستیں خود اپنے تیل کی پیداوار کے حجم اور اس کی قیمت مقرر کرنے سے محروم ہیں ۔امریکہ ہی ان کے معاشی اور دفاعی معاملات کا ہدایت کار ہے۔غرض مشرق وسطیٰ میں ایران اور شام لبنانی مزاحمتی گروپوں کے علاوہ کوئی دوسرا ملک سامراجیوں کی پالیسی کی مخالفت کی جرات نہیں رکھتا۔

پالیسیاں، اشرافیہ، عوام اور ادارے

افتخار بھٹہ

قیام پاکستان کے چونسٹھ سال بعد آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ اندرونی اور بیرونی حکمت عملیوں کا تعین کون کرتا ہے۔ بظاہری طور پر ملک میں پارلیمنٹ بھی کئی موقوں پر موجود رہی ہے جس کے ممبران کی اکثریت مخصوص طبقات پر مشتمل ہوتی ہے اور انہیں علاقائی، مقامی وضلعی سطح پر کوئی چیلنج درپیش نہیں ہوتا ہے کیونکہ وہ موروثی طور پر ان علاقوں کے حاکم قرار دیئے جاتے ہیں جس کی بنیاد ذات برادری، دولت اور مقتدرہ طبقات سے روابط ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ اقتدار کے ایوان میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ملک میں آنے والے ہر آمر اور جمہوری راہنما نے ان کی حمایت کے ذریعہ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملک میں بنائی جانے والی تمام پالیسیاں انہی طبقات کے مفادات کی عکاس ہوتی ہیں۔ حکمت عملی کے اس حوالہ سے نقطہ نظر (اپروچ) کو اشرافیہ (Elistists) کی سوچ قرار دیا جاتا ہے جس میں عوامی مفادات وحقوق کو نظرانداز کر کے پالیسیاں سطحی، ڈنگ ٹپاؤ اور عوام کے حقوق کے منافی بنائی جاتی ہیں۔ بظاہری طور پر ان اقدامات کو جذباتیت کے ذریعہ عوامی مفاد کا رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے مگر ان کا سماج کی تبدیلی جہالت وغربت کے خاتمہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے چنانچہ ترقی پذیر ممالک میں اشرافیہ کے نمائندہ ادارے غیر جمہوری، غیر انسانی استحصال پر مبنی سسٹم کو جاری رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں تا کہ ان کی سیاست، معیشت اور سماجیت پر جکڑ قائم رہے اور ان کی نسلیں اقتدار پر فائز رہیں۔ ان ممالک میں نظریات، تعلیم وشعور اور جدیدیت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

ہم قیام پاکستان کے بعد سے جمہوریت کے حوالہ سے مختلف تجربات میں مصروف عمل ہیں۔ 1958ء سے قبل قائم ہونے والی تمام اسمبلیاں جاگیردار طبقات کی نمائندہ تھیں۔ آئے دن حکومتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اسمبلی میں کوئی قانون سازی نہیں ہوسکتی تھی۔ ملک طویل عرصہ تک بنیادی فریم ورک آئین سے محروم رہا۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک میں مارشل لاء کا نفاذ کر دیا گیا تھا جس میں سیاستدانوں کو ایبڈو کے ذریعہ سیاست سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی اور کچھ سیاستدانوں کو ساتھ ملا لیا گیا۔ صدر ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے ملک کی اکثریتی آبادی کو رائے دہندگی سے محروم کر کے ملک کی تقدیر 80 ہزار بی ڈی ممبران کے ہاتھوں میں تھما دی۔ ان کی مدد سے اسمبلیاں وجود میں آئیں امریکہ کے ساتھ تعلقات میں اضافہ ہوا جس سے علاقائی کشیدگی بڑھی اس کی تمام پالیسیاں عوام کے مفادات کے خلاف تھیں۔ 1965ء میں ہندوستان کے ساتھ جنگ کا آغاز کیا جس کے نتیجہ میں امریکہ نے پاکستان پر پابندیاں عائد کر دیں۔ ملک میں مہنگائی اور اقربا پروری کے خلاف جلوس نکالے گئے۔ اس تحریک کے نتیجہ میں ایک عوامی سوچ ابھر کر آئی جو کہ populous طریقہ سے پالیسیوں کو ترتیب دینا چاہتی تھی۔ اس تحریک کو روکنے کے لئے جنرل یحییٰ خان اقتدار میں لائے گئے۔ مگر 1970ء کے انتخابات میں عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کی کامیابی کے بعد تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے یہ دونوں جماعتیں عوامی حقوق کی علمبردار تھیں اور ان کی عوامی مسائل کے حل کے حوالہ سے اپروچ خاصی مثبت تھی۔ انہیں اس ضمن میں عوام کی حمایت بھی حاصل تھی۔ مگر دونوں کچھ صوبائی اختیارات کے معاملات کے بارے میں تحفظات رکھتی تھیں۔ انہیں اختلافات کو اشرافیہ نے اچھال کر مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع کی گئی جس کے نتیجہ میں سانحہ پاکستان رونماء ہوا۔ اس کو علیحدگی کی جنگ میں تبدیل کرنے میں اشرافیہ کی سرپرستی میں عوامی حقوق سے محروم سیاسی اور مذہبی جماعتوں کا اہم کردار تھا جن کو ایجنسیاں اور غیر ملکی ادارے اپنے مخصوص مفادات کی خاطر کبھی الشمس البدر کبھی نظام مصطفیٰ کی تحریک اور کبھی وکلاء کی عدلیہ بحالی کی تحریک کی شکل میں استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔ ملک میں اشرافیہ اور عوامی مفادات کے افکار اور لائحہ عمل فکر ونظر میں خاصے تضادات پائے جاتے ہیں مگر بدقسمتی سے نچلے طبقات کی سیاست کرنے والی سیکولر اور بائیں بازو کی جماعتیں کسی اتحاد اور مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے میں ناکام رہی ہیں جس سے استحصالی طبقات کے خلاف کوئی تحریک متحرک کی جاسکتی۔

کسی ملک کی پالیسیوں اور نظام پیداوار کے درمیان جڑت ہوتی ہے اگر ہم اقتصادی طور پر خوشحال ہیں، صنعتکاری کا پیداواری عمل موجود ہے جن کی وسائل سے عوام کے حقوق، تعلیم، روزگار، صحت وصفائی کے مسائل حل ہو رہے ہیں جس سے ترقی کا سفر جاری ہے تو اس خود انحصاری کی بنیاد پر ہم خود مختار پالیسیاں اختیار کر سکتے ہیں جو کہ مکمل طور پر قومی مفاد میں ہوں گی۔ ایسی صورت حال میں ریاست کو اندرونی طور پر کوئی خدشات لاحق نہیں ہوتے یں کیونکہ عوام کی حمایت بھرپور طریقہ سے حکومت کے ساتھ ہوتی ہے۔ تمام جماعتیں جمہوریت اور انصاف کی موجودگی میں ایک جیسی قومی پالیسیوں کی حمایت کرتی ہیں۔ اگر آج ایران کی حکومت امریکی سامراجیت کو للکار رہی ہے تو اس کے پاس تیل کے وسائل اور عوام کی حمایت موجود ہے۔ وہاں پر ایک عوام دوست نظام قائم ہے۔ وینزویلا میں ھیوگوشاویز کے پاس تیل کے وسیع ذخائر موجود ہیں جس کی بنیاد پر اس کے ساتھ عوام کی حمایت بھی ہے۔ مگر پاکستان میں تمام صورتحال اس کے برعکس ہے ہمارے پاس لفاظی کے حوالہ سے بے پناہ وسائل موجود ہیں ہم کھانے کا تیل، گندم اور دیگر خوراک کی اشیاء اربوں روپے مالیت کی درآمد کرتے ہیں بجٹ اور کرنٹ اکاؤنٹ خساروں سے دوچار ہیں ملک میں بجلی کا بحران صنعتوں کی بربادی کا باعث بن رہا ہے، بھاری بھرکم وزراء کی کابینہ موجود ہے امداد اور قرضوں کے حصول کے لئے عالمی مالیاتی اداروں کے محتاج ہیں۔ ملک کے اندر خانہ جنگی کی کیفیات موجود ہیں اس معاشی ابتر صورتحال میں ہماری مذہبی جماعتیں اور دائیں بازو کے گروپ امریکہ اور مغربی طاقتوں کو للکارنے کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ حکومت محدود وسائل کی وجہ سے عامی مسائل کے حل کرنے کی سکت نہیں رکھتی ہے۔

یہ تمام صورتحال ہمارے پالیسی ساز اداروں اور افراد کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے جنہوں نے اپنے اقتدار کے استحکام کی خاطر سوویت یونین کی پیش قدمی روکنے کے نام پر عسکریت پسندی کو مضبوط معیشت کے برعکس ریاست کے استحکام کے لئے ضروری قرار دیا۔ یہ عمل سینٹو اور سیٹو میں شمولیت سے جاری ہے جبکہ ہم نے امریکہ کے ہتھیاروں کا پاکستان میں ذخیرہ قائم کیا۔ جنرل ضیاء الحق نے افغان جہاد کے نام پر عسکریت پسند گروپوں کو مضبوط کیا۔ اسلام کے نام پر ایک مخصوص مکتبہ فکر کی سوچ اور جہاد کو ابھارا گیا۔ اور تمام حقیقی سیاسی قوتوں کو یرغمال بنا لیا گیا۔ پاکستان کے تمام سول اور فوجی ادارے دائیں بازو کے دانشور، مذہبی جماعتیں موجودہ صورت حال کی مکمل طور پر ذمہ دار ہیں جنہوں نے عسکریت پسندی کو ابھارنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ جس کا مقصد تضادات کو ابھارنا اور سیاسی جماعتوں کو ڈیفیوز کر کے عوام کی سوچ کو غیر سیاسی بنانا تھا تا کہ عوام کو حقیقی مسائل کے حل کی جدوجہد سے دور رکھا جا سکے۔ ایم کیو ایم اور علاقائی گروپوں کی سرپرستی کا مقصد سیاسی انتشار کو بڑھانا تھا اس عمل میں جنرل ضیاء الحق خاصے کامیاب رہے۔ انہوں نے فرقہ وارانہ نفرتوں میں بھی اضافہ کیا۔ اس سارے عمل میں ملک کی تمام سیاسی جماعتوں اور قیادتوں نے انکا بھرپور طور پر ساتھ دیا۔ گیارہ سال تک ضیاء الحق کے مشن کو آگے بڑھانے والے طالبنائزیشن کے نظام کو پسند کرنے والے اور اپوزیشن کو دیوار کے ساتھ لگانے والے آج جمہوریت کے چمپیئن بننے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں ماضی میں جمہوریت کا بوری بستر گول کرنے والے عوامی حمایت سے محروم سیاسی جماعتیں ان کے ساتھ موجود ہیں۔ اس ضمن میں ملک کی نام نہاد سول سوسائٹی جس میں سابق فوجی اور بیوروکریٹ بھی ان کے ساتھ شامل ہیں جنہوں نے اپنے دور اقتدار میں اپنی اشرافیہ کی سوچ پر مبنی پالیسیوں کے ذریعہ ملک کو موجودہ تباہ کن صورتحال تک پہنچانے میں کوئی کسر روا نہیں رکھی ہے۔ ہم پاکستان کے سیاسی راہنماؤں کی پالیسیوں اور حکمت عملیوں کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ سوائے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے پہلے دور حکومت کے بعد کسی بھی جماعت یا آمر کی سوچ عوامی نہیں رہی ہے۔ اور نہ ہی انہوں نے عوام کے مفادات میں قانون سازی کی ہے۔ بلکہ ان تمام حکمرانوں نے مخصوص سوچ اور مفادات کے حامل طبقات پر مشتمل علاقائی اجارہ داروں پر مشتمل گروپ بنائے ہیں جن کی سیاسی جماعت کا نام اقتدار پارٹی ہے۔

پاکستان میں تمام پالیسیاں اور ترجیحات کا تعین پارلیمنٹ سے باہر فرد واحد فرد یا آمرانہ حکومتیں قومی مفاد کے نام پر کرتی ہیں۔ جس میں نجکاری کے ذریعہ قومی تحویل میں سرکاری اداروں کی لوٹ سیل ہوتی ہے موجودہ حکومت نے بھی محکمہ ریلوے، ڈاک اور بجلی پیدا کرنے کے پراجیکٹس کی نجکاری کا عندیہ دیا ہے جس سے عوامی مفاد کے ادارے سرمایہ کاروں کو فروخت کئے جائیں گے اور ملازموں کی ڈاؤن سائزنگ کی جائے گی۔ یہ نجکاری کا عمل گزشتہ کئی سالوں سے جاری ہے، نواز شریف کی سابقہ حکومت نے ملک کی مالیاتی ادارے اور فیکٹریاں کوڑیوں کے دام اپنے حامیوں کے ہاتھوں فروخت کر دی تھیں موجودہ صورتحال میں جبکہ دنیا کے تمام مالیاتی ادارے، کاریں تیار کرنے والی صنعت، الیکٹرانکس اور دیگر مصنوعات تیار کرنے والی فیکٹریاں عالمی سطح پر بحرانی کیفیت سے دوچار ہیں اور ان کی حکومتیں کئی اداروں میں بھاری سرمایہ کاری کر کے انہیں قومی تحویل میں لے رہی ہیں تا کہ سرمایہ دارانہ نظام کو ناکامی اور تباہی سے بچایا جا سکے ان حالات میں اس کے برعکس پاکستان میں شوکت ترین نجکاری کے عمل کو آگے بڑھانے کا اعلان کر رہے ہیں۔ نجکاری کے حوالہ سے اسمبلی کے تمام اراکین اور سیاسی پارٹیوں میں اتفاق رائے موجود ہے کیونکہ ان تمام کا تعلق عوام سے نہیں بلکہ اشرافیہ سے ہے جو کہ محض اپنے مفادات کے حوالہ سے عمل کرتی ہے جبکہ عوام کے غریب طبقات بالخصوص محنت کشوں اور بائیں بازو کی تنظیمیں اس حوالہ سے احتجاج کریں گی۔ سابقہ دور کی نجکاری شدہ اداروں میں کوئی نئی سرمایہ کاری نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی انہیں ضرورت اور جدیدیت کے تقاضوں کے ساتھ اپ ڈیٹ کیا گیا ہے۔ نہ ہی ان اداروں میں روزگار کے مواقع بڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ادارے بند ہو چکے ہیں یا انکو کمرشل پلاٹس کی شکل میں فروخت کر دیا گیا ہے۔ دوسری طرف ملک کی تاجر اور صنعتکار برادری ہمیشہ مراعات کا مطالبہ کرتی ہے۔ ٹریڈرز کا کام شرح منافع زیادہ ہونے کیوجہ سے کافی پھیل رہا ہے۔ جگہ جگہ سپر سٹور اور پلازے تعمیر کئے جا رہے ہیں مگر معیشت کے پھیلاؤ اور آمدنی کے اضافے کے بعد ٹیکسوں کی وصولی کی شرح میں اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ کاروباری طبقات اپنی آمدن کے تناسب سے کہیں کم ٹیکس ادا کرتے اور اکثر بالکل دیتے ہی نہیں ہیں۔ ان تمام طبقات کو بھی پالیسی ساز اداروں کی حمایت حاصل ہے کیونکہ ان کے نمائندے رشتہ دار اور دوست اسمبلیوں میں موجود ہیں لہٰذا اس ضمن میں اسمبلی کے اراکین نے کبھی احتجاج نہیں کیا ہے بلکہ حکومت امدادی رقوم کے ذریعے ان کے اداروں کو سستی گیس اور بجلی فراہم کرتی ہے۔ بہانوں سے انہیں سبسڈی سے بھی نوازا جاتا ہے۔

ہمارے منتخب اداروں میں نان ایشوز پر سب سے زیادہ بحث کی جاتی ہے جس کو الیکٹرانکس میڈیا سب سے زیادہ ابھارتا ہے جبکہ عوام کے حقیقی مسائل غربت، جہالت اور بے روزگاری کے بارے میں کبھی کوئی حل پیش نہیں کیا گیا کیوں کہ یہ ان کا مسئلہ ہی نہیں وہ تو عوام کو بھول بھلیوں میں الجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ صورتحال قیام پاکستان کے بعد سے جاری ہے کہ ہمارے دانشور عوام کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹانے کے لئے مذاکرے اور مناظرے کرتے رہتے ہیں۔ اپنی بنائی ہوئی خود ساختہ ناکام پالیسیوں کی مخالفت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کسی جج کی بیٹی کو زیادہ نمبر دینے کا قضیہ لے بیٹھتے ہیں۔ کبھی ججوں کی بحالی کو ملک کی سلامتی اور جمہوریت کی بقاء کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس ادارے کے 80 فیصد ججوں نے دوبارہ حلف کے بعد ملازمت جائن کر لی ہے کبھی وہ ریاست کے خلاف لڑنے والوں کو بطور ہیرو پیش کرتے ہیں دوسری طرف سائنس، ٹیکنالوجی اور جدید تعلیم کے حوالہ ترجیحات سے بالکل قابل ذکر نہیں ہیں۔ ہمارے پالیسی ساز ادارے اور میڈیا پر مسائل اور تکالیف کے حوالے سے شور مچایا جاتا ہے مگر اس کے حل کے بارے میں کوئی تجاویز پیش نہیں کی جاتیں ہیں جو کہ معروضی حالات سے ہم آہنگ ہوں۔ یہی وجہ ہے ہم ترقی کے لئے کوئی قابل عمل روڈ میپ تیار نہیں کر سکے

ہیں۔ وسائل کی کمی اور عالمی مالیاتی اداروں کے انحصار کی وجہ سے ہم صرف قومی مفادات اور عوام کے امنگوں کے مطابق کوئی حکمت عملی ترتیب دینے سے قاصر ہیں۔

ہمارا نظام تعلیم بھی طبقاتی، مذہبی فرقہ وارانہ حوالوں پر مبنی ہے جس میں روایتی علوم کے علاوہ کچھ موجود نہیں ہے اور نہ ہی کورس کو پانچ سال بعد جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں اپ ڈیٹ کیا جاتا ہے۔ جبکہ سرمایہ داروں کے بچے بیرون ممالک اعلیٰ تعلیمی مہارتوں کے ذریعہ بہتر جاب کے مواقع حاصل کرتے ہیں۔ ملک میں کاغذی ڈگریوں کی تقسیم کا کام پرائیویٹ یونیورسٹیوں کے قیام کی وجہ سے کافی پھیل چکا ہے مگر ایسے کامیاب نوجوانوں کی زیادہ تعداد اپنے شعبہ کے بارے میں کچھ معلومات نہیں رکھتی ہے اس طرح تعلیمی پالیسیاں بھی سماج میں شعور و آگہی، روشن خیالی اور سماجی تبدیلیاں لانے میں ناکام رہی ہیں۔ آج سرکاری شعبہ میں قائم یونیورسٹیاں مالی بحران سے دوچار ہیں۔ ایسی صورتحال میں ہم پالیسی سازوں کی عقل و دانش پر کیا تبصرہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے مسائل کی نشاندہی کی ہے مگر اس کی حقیقی وجوہات کبھی بیان نہیں کی ہیں۔ کسی مسئلے کو صحیح طریقہ سے سمجھنے سے اس کا آدھا حل تلاش کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ملک میں خودکش دھماکوں کی وجوہات امریکی ڈرون حملوں کا ردعمل قرار دینا حالانکہ دوسرے موقف کے مطابق یہ قانون کی حاکمیت سے انکار اور امن عامہ کی بگڑتی ہوئی صورتحال کا معاملہ ہو سکتا ہے۔

کسی سماج میں کس طرح ایشوز ابھرتے اور پیدا کئے جاتے ہیں اس میں پالیسی سازاداروں اور میڈیا کا کردار کیا ہوتا ہے یہ ایک بحث طلب معاملہ ہے۔ پاکستان اس حوالہ سے سائیکل مختلف ادوار میں پیدا ہوئے ہیں جن میں نان ایشوز اور ماضی پرستی کے حوالہ سے تحریکوں کو پیدا کیا گیا مگر ان کا انجام اور خاتمہ غیر منتخب اور آمرانہ حکومتوں کی شکل میں ہوا۔ آج بھی ملک میں غیر ایشوز کو ابھارا جا رہا ہے جبکہ اصل حقیقی مسائل کو عوام سے اوجھل رکھا جاتا ہے۔ عوامی مقبولیت رکھنے والی اور ووٹ کے ذریعہ برسر اقتدار آنے والی جماعتوں کے اقتدار کو غیر مستحکم کرنے کے لئے انتخابات میں ناکام جماعتیں قومی مفادات اور سالمیت کے نام پر رائے عامہ کو متحرک کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کی تحریک کا مقصد کسی ادارے اور اجتماعی سوچ کو استحکام بخشنا نہیں ہوتا بلکہ یہ کسی شخصیت کے حوالے سے اکٹھا ہوتی ہیں اور ہیروشپ کے ذریعہ اپنے غیر نظریاتی اور غیر عوامی ایجنڈے کی تکمیل چاہتی ہیں۔ سرد جنگ کے دوران سوویت یونین اور کمیونزم کو روکنا امریکہ اور مغربی اقوام کی ضرورت تھی چنانچہ اسی حوالہ سے عسکریت پسندانہ پالیسیوں کو فروغ دیا گیا۔ غیر ترقی یافتہ اور غریب ریاستوں میں جمہوریت کی بجائے عسکریت پسندی کو فروغ دیا گیا یہ عمل 1960ء سے 1980ء تک جاری رہا۔ جس کو افغانستان میں سوویت یونین کی واپسی کے بعد ریسورس کر دیا گیا ہے جو موجودہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو کامیاب کروانے کے لئے امریکی صدر نئی پالیسیاں بنانے میں مصروف ہے جب کہ ہم سرد جنگ کی مصنوعات کے ساتھ امن کی خاطر معاہدے کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ ہماری ریاست قیام پاکستان کے بعد سے ہی (militarilisation) عسکریت پسندی کی سوچ سے باہر نہیں نکل سکی ہے۔ کیونکہ دفاع کو مضبوط کرنا ہمیشہ ہماری مجبوری رہی ہے کیونکہ ہماری شروع کی قیادت نے روز اول سے ہی سرد جنگ میں فرنٹ لائن سٹیٹ کی حیثیت دے دی تھی جس کی وجہ سے دیگر شعبہ ہائے زندگی پر زیادہ توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ ان پالیسیوں کی وجہ سے سیاسی جماعتیں و ادارے کمزور نظریاتی افکار میں تنزلی اور قومی ترقی کے لئے پالیسیوں کا رول ماڈل سامنے نہیں لایا جا سکا ہے۔ ہماری ترجیحات کے مثبت سے زیادہ منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ پاکستان میں عسکریت پسندی اور تشدد کی سیاست کا بار بار ابھار ہوتا ہے اور اب ملک کا کوئی کونہ عسکریت پسندوں سے محفوظ نہیں ہے۔ بچوں اور عورتوں کو ایک سازش کے تحت تعلیم اور سماج کی بہتری کے عملی کردار سے روکا جا رہا ہے۔ ان کا نظام عدل و انصاف تو فراہم کر سکتا ہے مگر پیداواری عمل میں اضافہ کے ذریعہ زندگی کی بنادی سہولتیں فراہم نہیں کر سکتا ہے۔

پاکستان میں مفاد عامہ کی معاشی پالیسی کو اختیار کرنا موجودہ حکمران طبقات کے بس میں نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سماج میں تبدیلی اور سماجی تبدیلیوں سے خائف ہیں۔ یہ موجودہ استحصال اور ناانصافی پر مبنی اپنے مفادات کے لئے فائدہ مند نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں وہ ملک میں علم، تکنیکی مہارتوں اور جدید ٹیکنالوجی کے حوالہ سے نئی نسل بلڈ اپ نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں تعلیمیافتہ طبقات، سول سوسائٹی، لبرل جماعتوں اور ترقی پسند جماعتوں کو دنیا کے عالمی پس منظر میں سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کے حوالہ سے پاکستانی سماج کو گلوبل تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنے اور غریب طبقات کی بہتری کی خاطر ایک نیا سوشل کنٹریکٹ introduce کرنے کی ضرورت ہے۔

تمام دنیا مستقبل کی کساد بازادی سے بچنے کے لئے مارکسزم کی روشنی میں نئے نظام کی تشکیل کے حوالہ سے غور و فکر کر رہی ہے۔ پاکستان کے پالیسی ساز اداروں کو مسترد شدہ ناکام معاشی پالیسیوں پر عمل کرنے کی بجائے عوامی سدھار کی خاطر اپنے رویوں اور ترجیحات کو تبدیل کرنا ہوا وگرنہ عسکریت پسندی ہمیں جہالت اور تاریکیوں میں غرق کر دے گی۔

نظم

عظمت نصیب، پیرس

اِک سنتالی ہورنہ دیناں
پنجابیں تھوتھا کھورنہ دینا
پچھلے کنڈے پیراں وچ نیں
کنڈیالے رستے تورنہ دینا ں
نہ دینا ں کوئی مروے واپھُل
ہوسی بھلابس تھوہر نہ دینا ں
چام چڑک تے اِلاں گرجاں
نہ دینا ں تے مور نہ دیناں
اِنج نیں ھُندا ،اِنج نیں ھندا
لڑانا ں پیچ اتے ڈور نہ دیناں

میر غوث بخش بزنجو، ایک تاریخ ساز شخصیت

ڈاکٹر تو صیف احمد خان

عظیم رہنما غوث بخش بزنجو کی 21ویں برسی 11 اگست کو منائی گئی۔ میر غوث بخش بزنجو کا شمار ان رہنماؤں میں ہوتا ہے جو ہمیشہ مستقبل کے بارے میں سوچتے تھے۔ میر غوث بخش بزنجو نے آزادئ اظہار، سیکولرازم، قومیتوں کی خود مختاری، استحصال سے پاک معاشرے اور پاکستان کے غیر جانبدارانہ کردار کی اہمیت کے حوالے سے ساری زندگی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ انہیں اپنے آدرش کی پاداش میں عہدے چھوڑنے پڑے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں مگر میر صاحب کے عزم میں خلش پیدا نہ ہوئی۔

میر بزنجو نے ہمیشہ جمہوری عمل کی حمایت کی اور جمہوریت پر اعتماد کی بنا پر جہاں وہ اسٹیبلشمنٹ کے لیے ناقابل قبول قرار پائے وہاں انہیں بائیں بازو کے بعض محدود سوچ رکھنے والے دانشوروں اور سیاسی کارکنوں کی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میر بزنجو کی بصیرت کے سب قائل ہو گئے۔ میر بزنجو کو بابائے بلوچستان کہا جاتا تھا، میر صاحب جمہوری معاملات کے حل کے لیے پرامن جدوجہد اور مذاکرات پر یقین رکھتے تھے اس لیے بعض صاحبان نے انہیں بابائے مذاکرات کا خطاب بھی دیا۔

میر بزنجو کی جدوجہد گذشتہ صدی کے تیسرے عشرے سے شروع ہوتی ہے۔ میر بزنجو 1917 میں ریاست قلات کے پسماندہ علاقے جھاؤ کے ایک گاؤں شانک میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کوئٹہ سے حاصل کی، پھر مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئے۔ میر صاحب نے طالب علمی کے زمانے سے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی۔ میر بزنجو ابتدائی دور سے کانگریس اور قوم پرست قیادت سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے ریاست قلات سے سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

میر بزنجو کے ساتھی ملک فیض محمد یوسف زئی نے میر صاحب کی شخصیت کے حوالے سے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے کہ میر بزنجو 1939 میں قلات نیشنل پارٹی کے سالانہ کنونشن میں شرکت کے لیے مستونگ آئے، وہ اس وقت کراچی میں زیر تعلیم تھے۔ میر صاحب اپنے ساتھ دو تین نوکر اور کپڑوں سے بھرے ہوئے دو تین بکس بھی ساتھ لائے تھے مگر پھر عوامی سیاست کو ایسا اپنایا کہ ایک وقت ایسا آیا کہ میر صاحب کھدر کے دو جوڑوں اور ایک کمبل بغل میں دبائے ایک جگہ سے دوسری جگہ رواں دواں ہوتے تھے۔

میر صاحب کو سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں 1939 سے 1942 تک قلات بدر کر دیا گیا۔ میر غوث بخش بزنجو کی سیاسی بصیرت کا اظہار 1947 میں اس وقت ہوا جب ریاست قلات کی اسمبلی دیوان عام میں بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کا مسئلہ پیش ہوا۔ میر بزنجو نے حزب اختلاف کے رہنما کی حیثیت سے بلوچستان کی پاکستان کے ساتھ الحاق کی مخالفت

کی۔ انہوں نے اپنی تاریخی تقریر میں بلوچستان کے پاکستان سے الحاق کے جو نقصانات بیان کیے تھے وہ بعد میں درست ثابت ہوئے۔ حکومت نے میر بزنجو کو جرات اظہار پر گرفتار کر لیا اور قلات نیشنل پارٹی پر پابندی لگا دی۔ یوں بلوچستان کے اس نوجوان رہنما کو آزادی کا تحفہ نظر بندی کی صورت میں ملا۔

میر بزنجو نے 1956 میں شہزادہ میر عبدالکریم کے ساتھ مل کر استمگان گل نامی جماعت قائم کی اور 1957 میں دیگر ترقی پسند جماعتوں کے اکابرین کے ساتھ مل کر عوامی لیگ کے ایک دھڑے نیشنل پارٹی کے ساتھ اشتراک کیا اور یوں نیشنل عوامی پارٹی قائم ہوئی۔ نیشنل عوامی پارٹی نے 1964 کے انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی مگر بعد میں مولانا بھاشانی ایوب خان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کے بعد فاطمہ جناح کی حمایت سے دستبردار ہوئے مگر میر غوث بخش بزنجو اور دوسرے رہنماؤں نے اپنی پارٹی کے فیصلے کے تحت فاطمہ جناح کی حمایت کی۔ یہ وہ دور تھا جب عالمی سوشلسٹ طاقتیں سوویت یونین اور چین ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئی تھیں۔

مولانا بھاشانی اور کمیونسٹ پارٹی کا ایک گروہ چین کی حمایت کرتا تھا۔ میر بزنجو سوویت یونین اور چین کے اختلاف کی بناء پر نیشنل عوامی پارٹی میں تقسیم کے خلاف تھے مگر بعض نادان دوستوں کی غلط حکمت عملی کی بنا پر نیپ ہی تقسیم نہیں ہوئی بلکہ اس کی ذیلی تنظیمیں بھی تقسیم ہوئیں۔ یوں طلبہ کی تنظیم نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور مزدور تنظیموں کی تقسیم سے پوری ترقی پسند تحریک کو شدید نقصان ہوا۔ میر صاحب نیپ کی تقسیم کے بعد نیشنل عوامی پارٹی کے سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ اس وقت خان ولی خان کو پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔

میر صاحب کو ایوب خان کے دور میں کرنسی نوٹوں پر نعرے لکھنے کے مقدمے میں کئی سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو کراچی سے صوبائی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ کے امیدوار حبیب اللہ پراچہ کو شکست دے کر منتخب ہوئے۔ یہ صوبائی اسمبلی کا حلقہ لیاری اور لسبیلہ کے کچھ حصوں پر مشتمل تھا۔ مسلم لیگ کے رہنما یوسف ہارون اور محمد ہارون بھی میر صاحب کے حامی تھے۔ کراچی شہر کے ترقی پسندوں اور قوم پرستوں نے اس انتخاب میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ یوں ایوب خان کے حامی امیدوار کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر 1968 کی ایوب خان کے خلاف تحریک میں سرگرم عمل رہے۔

جنرل یحییٰ خان نے 1970 میں ون یونٹ ختم کر کے بلوچستان کی صوبے کی حیثیت بحال کی۔ یوں 1970 کے انتخابات میں مکران سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جب مارچ 1971 میں جنرل یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں قومی

اسمبلی کا اجلاس طلب کیا اور پیپلز پارٹی کے قائد ذوالفقار علی بھٹو نے قومی اسمبلی کے اس اجلاس کا بائیکاٹ کا اعلان کیا اور دھمکی دی کہ مغربی پاکستان سے اجلاس میں شرکت کرنے والوں کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی تو میر غوث بخش بزنجو نے نیپ کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جائیں گے۔

میر صاحب ڈھاکہ گئے، انہوں نے عوامی لیگ کے قائد شیخ مجیب الرحمٰن سے طویل مذاکرت کئے اور کوشش کی کہ مجیب الرحمٰن اور پیپلز پارٹی کے درمیان سمجھوتے کی کوئی راہ نکل آئے مگر جنرل یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے سخت رویے کی بنا پر سیاسی تعطل پیدا ہوا۔ میر صاحب سمیت مغربی پاکستان کے دوسرے قائدین مایوس چلے آئے مگر میر بزنجو دوستوں کے اصرار پر دوبارہ ڈھاکہ گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب شیخ مجیب الرحمٰن نے مذاکرات ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا مگر میر بزنجو کی خواہش پر شیخ مجیب الرحمٰن مذاکرت پر آمادہ ہوئے اور میر صاحب کو اپنی قیام گاہ پر قیام کی دعوت دی مگر میر صاحب کی مصالحتی کوشش ناکام ہوگئی۔

پاکستانی فوج نے بنگالی عوام کی نسل کشی کی اس جنگ میں 30 لاکھ افراد جاں بحق ہوئے اور 17 دسمبر کو پاکستانی فوج نے ریس کورس گراؤنڈ ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیئے اور بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ اگر میر صاحب کی بات مان لی جاتی تو نہ لاکھوں افراد مرتے نہ پاکستان ٹوٹتا۔ پھر نئے پاکستان میں بزنجو کا ایک اور جمہوری کردار واضح ہوا۔ اب پیپلز پارٹی پنجاب اور سندھ میں اکثریت رکھتی تھی۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی اکثریت تھی۔ پیپلز پارٹی کی صوبہ سرحد میں ایک نشست تھی جبکہ بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی کوئی نشست نہ تھی۔

بھٹو صاحب نے صدر کا عہدہ سنبھالتے ہی غوث بخش رئیسانی کو بلوچستان کا گورنر بنا دیا جس پر پورے بلوچستان میں سخت احتجاج ہوا۔ پھر نیشنل عوامی پارٹی اور پیپلز پارٹی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے تحت میر غوث بخش بزنجو، بلوچستان کے گورنر اور ارباب سکندر خلیل صوبہ سرحد کے گورنر مقرر ہوئے۔ بلوچستان میں سردار عطاء اللہ مینگل اور صوبہ سرحد میں جمعیت علمائے اسلام کے مفتی محمود وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ صوبہ بلوچستان کو پہلی دفعہ اپنے حقیقی نمائندوں پر مشتمل حکومت ملی۔ میر بزنجو کی یہ کوشش تھی کہ یہ حکومتیں برقرار رہیں تاکہ دونوں صوبوں میں ترقی کا عمل تیز ہو سکے۔

میر بزنجو عوامی گورنر تھے، انہوں نے اپنے عوامی انداز کو برقرار رکھا۔ میر غوث بخش بزنجو کے پولیٹیکل سیکریٹری بی ایم کٹی نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ اس دور میں میر صاحب پشاور گئے اور پھر میر صاحب اور ارباب سکندر ایک گاڑی میں مری گئے۔ انہوں نے راستے میں عوامی چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پی۔ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے مارشل لاء کے خاتمے کے لیے عبوری آئین بنایا اور مستقل آئین کی تیاری کے لیے پارلیمنٹ میں موجود سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں پر مشتمل آئین ساز کمیٹی قائم کی۔ میر صاحب کو نیپ کی جانب سے اس کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا۔

میر صاحب نے ایک سیکولر جمہوری اور وفاقی آئین کی تیاری کے لیے اپنے دوستوں کی مدد سے آئین کا مسودہ تیار کیا اور بنیادی اصولوں پر ایک معاہدہ ہوا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان کو یہ معاہدہ پسند نہیں تھا۔ میر غوث بخش بزنجو اس وقت کمیونسٹ پارٹی کی پولٹ بیورو کے رکن تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ایک فعال کارکن کا کہنا ہے کہ میر بزنجو نے اس آئینی معاہدے کی تیاری کے لیے کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل نازش امروہوی سے مشورے کیے اور ان کی منظوری سے اس معاہدے پر دستخط کیے۔ مگر کمیونسٹ پارٹی کی پولٹ بیورو کے رکن پروفیسر جمال نقوی نے پولٹ بیورو کی منظوری کے بغیر اس معاہدے کی مخالفت شروع کر دی اور ان کی ایما پر کراچی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری نواز بٹ نے اس معاہدے کے خلاف اخبارات میں بیان جاری کر دیا۔

پھر پشاور میں نیشنل عوامی پارٹی کی نیشنل کونسل کا اجلاس 14 گھنٹے تک جاری رہا۔ میر صاحب کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا، میر صاحب نے ہر رکن کی تنقید خندہ پیشانی سے برداشت کی۔ یوں ایک عظیم رہنما کی حیثیت سے اپنے جمہوری رویے کا ثبوت دیا جس کی نہ ماضی میں کوئی مثال ملتی تھی نہ مستقبل میں ایسی کوئی مثال سامنے آئی۔ مگر اس صورتحال کا یہ نتیجہ نکلا کہ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے آئین کی تیاری کے لیے جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور اور جمعیت علمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی پر انحصار کر لیا۔ یوں آئین میں اسلامی شقیں شامل ہوئیں۔ اس طرح ایک سیکولر اور جمہوری آئین بنانے کی کوشش بائیں بازو کے انتہائی محدود سوچ رکھنے والے رہنماؤں اور پختون قوم پرستوں کے رویے کی بنا پر ناکام ہوئیں جس کا نقصان ہر آنے والی نسل کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔

میر بزنجو کی مسلسل کوشش تھی کہ بلوچستان اور سرحد میں نیپ اور جے یو آئی کی حکومتیں برقرار رہیں اور مرکز میں پیپلز پارٹی حکومت کرے۔ یہی وجہ تھی کہ قومی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے انہوں نے 1973 کے آئین کی تیاری میں بھرپور حصہ لیا۔ یوں ایک ایسا آئین تیار ہوگیا جس میں پہلی دفعہ صوبائی خودمختاری کے تصور کو تسلیم کیا گیا تھا مگر بزنجو آئین میں وفاق کی چار وزارتوں کے علاوہ باقی تمام وزارتیں صوبوں کو منتقل کرنے کے حامی تھے۔ پیپلز پارٹی نے آئین میں کنکرنٹ فہرست شامل کی جس میں شامل امور پر وفاق اور صوبوں دونوں کا حق تھا لیکن دراصل اس فہرست میں شامل امور صوبے کے پاس ہونے چاہئیں تھے۔ میر صاحب کے اصرار پر وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے وعدہ کیا کہ 10 سال بعد کنکرنٹ فہرست ختم کر دی جائے گی۔ مگر آئین میں کی گئی 18 ویں ترمیم میں آخر کار صوبوں کو ان کے حقوق مل گئے۔

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے نیپ کی حکومتیں توڑ کر میر بزنجو سمیت دوسرے رہنماؤں کو حیدرآباد سازش کیس میں ملوث کیا اور نیپ پر پابندی لگا دی گئی۔ میر بزنجو کے بھٹو صاحب سے قریبی تعلقات تھے، بھٹو صاحب نے بی ایم کٹی کے ذریعے میر بزنجو کو جیل سے تنہا آ کر مذاکرت کرنے کی پیشکش کی مگر میر صاحب نے اپنے ساتھیوں سے علیحدہ مذاکرت سے انکار کر دیا۔ انہوں نے 1977 کی پی این اے کی تحریک کے دوران بھٹو صاحب کو وارننگ بھجوائی کہ فوج ان کی حکومت کا تختہ الٹ دے گی۔ بھٹو صاحب یہ سمجھتے تھے کہ میر صاحب جیل کی چار دیواری میں برسوں سے قید ہیں، انہیں اسلام آباد کے حالات کا علم نہیں

ہوسکتا اور فوجی جنرل تو روز ان سے تابعداری کا اظہار کرتے ہیں مگر تاریخ نے میر بزنجو کی وارننگ کو درست ثابت کیا۔

1977ء میں میر بزنجو جیل سے رہا ہوئے۔ میر بزنجو فوجی حکومت کے خلاف سخت مؤقف رکھتے تھے۔ وہ افغانستان کے سرخ انقلاب کے زبردست حامی تھے۔ انہی امور پر اختلافات کی بنا پر میر بزنجو عوامی نیشنل پارٹی سے علیٰحدہ ہوئے اور نیشنل پارٹی قائم کی۔ میر صاحب کا کہنا تھا کہ افغان انقلاب کے خلاف سازشوں سے یہ خطہ شدید متاثر ہوگا۔ میر بزنجو نے بھارت کے ایک معروف صحافی کی کتاب ''پاکستان انڈین فیکٹر'' میں دیئے گئے انٹرویو میں کہا تھا کہ اس مسئلے پر بڑی چیخ و پکار مچی ہوئی ہے کہ روس اس علاقے میں آ گیا اور روس کو گرم پانی کی بندرگاہ چاہئے جب کہ روس کا افغانستان میں اقدام امریکی خارجہ پالیسی کی ہی بگڑتی ہوئی شکل ہے۔

افغانستان اس سرزمین سے متصل ہے جس میں ایسے علاقے شامل ہیں جو سوویت یونین کا حصہ ہیں۔ اس علاقے میں کئی ایک خودمختار ریاستیں ہیں جن میں سے افغانستان ایک ہے۔ دراصل سردار داؤد کے اقتدار میں آنے کے بعد مغربی ممالک نے اپنے حلیفوں کے ذریعے انہیں خریدنے کی کوشش کی جن طاقتوں میں ایران، سعودی عرب اور پاکستان شامل تھے۔

داؤد کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ امریکہ کے ایجنٹ کے طور پر کام کرے اس لیے سردار داؤد نے پاکستان کے دورے کے بعد افغانستان کی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے خلاف کارروائی کی۔ اس کے اہم رہنماؤں کو جیل بھجوایا۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پی ڈی پی کے حامی فوجیوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ اس صورتحال میں وہاں کی پارٹی کے پاس انقلاب برپا کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اب افغانستان کے انقلاب کو امریکہ کی مدد سے ناکام بنانے کی کوششوں سے پاکستان سمیت پورا خطہ متاثر ہوا۔ یوں افغان انقلاب کی ناکامی کے بعد سے اب تک کی صورتحال سے میر صاحب کی باتیں درست ثابت ہوئی ہیں۔

میر صاحب پرامن جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ انہیں جنرل ضیاء الحق کے خلاف قائم ہونے والے اپوزیشن کے اتحاد ایم آر ڈی کے منشور پر اعتراض تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک قومیتوں کے حقوق کے بارے میں نکات اس منشور میں شامل نہیں ہونگے فوجی آمریت کے خلاف جدوجہد کے حقیقی مقاصد حاصل نہیں ہوسکتے۔ اس اختلاف کے باوجود میر بزنجو نے ایم آر ڈی کی تحریک کی حمایت کی اور ایم آر ڈی کے دوستوں کو صوبائی خودمختاری کے مسئلے پر متفق کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

1988 میں میر صاحب کو انتخابات میں شکست ہوئی مگر ان کے عزم میں فرق نہ آیا۔ جب نواب اکبر بگٹی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنے تو میر صاحب نے کہا کہ اختلافات کے باوجود وہ اکبر بگٹی کی حکومت کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ 15 برس بعد ہی سہی بلوچستان میں ایک سویلین حکومت تو قائم ہوئی ہے۔ میر صاحب بلوچستان کے حقوق کے لیے پرامن جدوجہد پر یقین رکھتے تھے، وہ سوشلزم اور سیکولرازم کے اصولوں کے تحت پاکستان کو ایک حقیقی فیڈریشن بنانے کے خواہاں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ خطے میں پرامن تحریکوں کی حمایت کی۔ اگر میر صاحب کی قیادت میں بایاں بازو جدوجہد کرتا تو اس ملک کی صورتحال تبدیل ہوچکی ہوتی۔ بلوچ نوجوان آج پھر بندوق کے ذریعے اپنے حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں، انہیں میر صاحب کی زندگی سے سبق سیکھنا چاہئے۔

بقیہ: فضل پورہ یونٹ کا قیام

،غریب اتحاد انجمن شمیہ پاکستان کی خواتین ونگ کی سربراہ اور ورکرز پارٹی کی رکن جمیلہ بیگم، نوجوان ایڈووکیٹ ایاز صفدر سندھو، رہنما ورکرز پارٹی شیخوپورہ، سیکریٹری امور محنت ورکرز پارٹی ضلع شیخوپورہ اور اتحاد کیمیکلز سی بی اے یونین کے جنرل سیکرٹری ملک محمد حیات، محمد عمران سیکرٹری امور زراعت ورکرز پارٹی پاکستان ضلع شیخوپورہ تھے۔ انقلابی شاعر شفیق احمد شفیق ،شیخوپورہ سے رب نواز ،اور ڈیرہ سہگل فارم سے کسان رہنما نواب دین نے اپنے کلام سے محفل کو گرمائے رکھا۔ نظامت کے فرائض نوجوان طارق جواد نے سرانجام دیے۔ ایاز صفدر سندھو نے اپنے خطاب میں برٹش دور کی لعنتیں اور اپنے مقامی خدمت گزاروں کو جاگیروں سے نوازنے اور جاگیردارانہ سماج میں کافی ونڈر پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ جاگیردار، وڈیرہ شاہی اور فوجی وسول نوکر شاہی ہی کے گٹھ جوڑ نے پاکستان کے قیام سے لیکر آج تک غریب عوام کو نچوڑا ہے۔ پارٹی راہنماؤں نے علاقہ کے مظلوم اور غیرت مند نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ پارٹی ہر قیمت پر آپ کے جان و مال کا تحفظ فراہم کرے گی۔ قانونی امداد مفت فراہم کی جائے گی۔

تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ نوجوان راہنما عدنان اشرف نے آبادی اور علاقہ کے عوام کی مشکلات پر مختصراً روشنی ڈالی اور کہا کہ ہم نے سوچ سمجھ کر ورکرز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کیا ہے اور ہم اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ جلسہ کی صدارت ورکرز پارٹی پاکستان ضلع شیخوپورہ کے صدر اور سنٹرل کمیٹی کے رکن غلام دستگیر محبوب نے کی اور تقریب کی ابتدا ہی میں آبادی کے لوگوں کے مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور نوجوانوں کو پارٹی کی رکنیت حاصل کرنے پر مبارک باد پیش کی۔ انہوں نے ورکرز پارٹی پاکستان کے راہنما اصول کا ابتدائیہ حاضرین کو پڑھ کر سنایا کہ

''ورکرز پارٹی پاکستان کا منتہائے مقصود ملکی اور عالمی سطح پر انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کی تمام مشکلوں کا خاتمہ ہے۔ اس مقصد کا حصول ایک لمبی اور صبر آزما جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے پارٹی اس جدوجہد کی تکمیل کے لئے، استحصال کے شکار پاکستان کے محنت کش اور دوسرے طبقات کو منظم کرے گی اور اپنی تحریک کو بین الاقوامی سطح پر جاری ایسی ہی دوسری تحریکوں سے مربوط کرے گی''

انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ حاضرین کو یقین دلایا کہ پارٹی ہر شکل میں آپ کے ساتھ ہوگی تاہم شرط لازم ہے کہ آپ مشکلات اور ظلم و ناانصافی کے خلاف کھڑے ہوجائیں۔ دنیا کی کوئی طاقت آپ کا بال بھی بیکا نہ کرسکے گی۔ انہوں نے ڈیرہ سہگل فارم کے مزارعین کے جدوجہد اور پارٹی سے وابستگی کے حوالے سے کامیابیوں کا ذکر کیا۔ اور سامعین کو یقین دلایا کہ آپ کی جدوجہد ہر حال میں رنگ لائے گی جلسہ کے آخر میں صدر جلسہ نے کارکنوں اور نوجوانوں کا شکریہ ادا کیا حاضرین نے جلسہ کے اختتام پر ورکرز پارٹی پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے۔

فیض ۔۔۔ امن اور محبت کا پیامبر

رشید سرابھا (نیوکیسل)

ایسے ناداں بھی نہ تھے جان سے گزرنے والے
ناصحو پند گرو راہ گزر تو دیکھو

کسے خبر تھی کہ کالا قادر گاؤں نارووال سیالکوٹ میں 1911 میں پیدا ہونے والا بچہ ایک دن بہت بڑا شاعر، امن اور محبت کا پیامبر، کسانوں اور محنت کشوں کا عظیم رہنماء بنے گا۔ اپنا کیریئر بطور انگلش لیکچرر امرتسر ایم۔اے۔او۔کالج 1935 میں شروع کیا۔ اسی کالج میں صاحبزادہ محمود الظفر اور ڈاکٹر رشیدہ جہاں بھی پڑھاتے تھے۔ جن کی نظروں نے فیض احمد فیض کو فیض بنا دیا۔ غم جاناں سے غم جہاں کی پرلذت وادی میں قدم رکھتے ہی تسخیر کائنات کا سفر شروع کر دیا۔ اپنی شاعری میں انسانی دکھوں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پرو دیا کہ حساس دل تڑپ اٹھتا ہے۔ قلم کی حرمت میں قید و بند بھی سہی۔ آزادیِ گفتار کے تقدس کو قائم رکھنے میں لاہور قلعہ میں بھی محبوس رہے۔

غزل میں ذات بھی ہے کائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی ہے

5 جولائی 2011 نیوکیسل گیٹ شیڈ سوک سنٹر کونسل چیمبر کے ہال میں شام فیض منائی گئی۔ جس کا اہتمام پاکستان آرٹ اینڈ کلچرل ٹرسٹ فیض نیشنل کمیٹی برطانیہ نے کیا تھا۔ فیض بطور شاعر، ٹریڈ یونین رہنماء، امن پسند اسکالر اور سوشلسٹ سیاسی راہنماء، مفکر، انسانی آزادی کے علمبردار ہونے پر مارٹن لیوی مارکسی دانشور، پیکٹ کے نائب صدر میاں صغیر احمد، نوراللہ میاں، سیاسی کارکن رشید رابھا نے پرمغز مقالے پڑھے۔

فیض مرکزی کمیٹی کے سیکرٹری پرویز فتح، انفارمیشن سیکرٹری محسن ذوالفقار اور نامور صحافی اور ادیب رضا علی عابدی جو اس تقریب کے صدر بھی اور مہمان خصوصی بھی تھے انہوں نے فکرِ فیض، عالمی امن اور انسانی حقوق کے لئے جدوجہد کا تفصیلی جائزہ لیا۔ مقررین نے بتایا کہ جب 1951ء پنڈی سازش کیس کا ذکر ہوگا تو برطانوی اور امریکی سامراج کا ذکر بھی چلے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کا کردار بھی زیرِ بحث آئے گا۔ نو آبادیات پر بھی بات ہوگی۔ پاکستان میں قبائلی اور جاگیردارانہ نظام پر بھی تبصرہ ہوگا۔

رشید سرابھا نے کہا فیض کے ساتھ دیگر سیاسی قیدیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہمارا قومی فریضہ بنتا ہے۔ انہوں نے میجر محمد اسحاق راہنما کسان پارٹی، ایئر کموڈور محمد خان جنجوعہ کے ساتھ سیاسی کام کیا ہے۔ ظفراللہ پوشنی، سید سجاد ظہیر، محمد حسین عطا، جنرل اکبر خان یہ سب لوگ محبِّ وطن تھے۔ عوام دوست راہنماء تھے۔ 1984ء میں میجر اسحاق محمد مرحوم نے بزریعہ خط فیض احمد فیض کی موت پر تعزیت بھی کی۔ اطلاع بھی دی کہ ہمارے قبیلے کا بہت بڑا انسان ہمیں چھوڑ گیا۔ راقم نے فیض کو 57-1956ء کراچی پاکستان ٹائم، امروز ہفت روزہ لیل ونہار میں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ پھر لندن 63-1962ء میں ملاقات رہی۔ برسوں بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس کسانوں کے عظیم اجتماع میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس 23 مارچ 1970ء پاکستان کے کسانوں، محنت کشوں، روشن خیال اور بائیں بازو کے لوگوں کا بہت بڑا اکٹھ تھا جس میں فیض موجود تھے۔ ان کے ساتھ مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی اور ان کے ساتھی، سی آر اسلم، سردار شوکت علی موجود تھے۔ مرزا محمد ابراہیم ریلوے یونین راہنما، محترمہ کنیز فاطمہ ٹریڈ یونین راہنماء کراچی سے اور پنجاب کسان کمیٹی کے رہنماء چودھری فتح محمد جو آج کل برطانیہ لیڈز میں چند ماہ کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ تو میزبان تھے۔ بائیں بازو کی تحریک ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مرکزی کردار کی حامل رہی ہے۔ آج فیض کی سو سالہ ولادت برطانیہ کے بہت سارے شہروں میں منائی جا رہی ہے تو ہم بھی اس کا حصہ ہیں۔ فیض نے پاکستان دولخت ہونے پر کہا تھا

کہیں سے لا کوئی سیلابِ اشک آب وضو
جس سے دھل جائیں تو شاید دھل جائے
میری گرد آلود آنکھوں کا لہو

بنگلہ دیش کی قومی آزادی انسانی بے گناہ خون میں دھل کر کامیاب ہوئی۔ پاکستان کے دو قومی نظریہ پر سوالیہ نشان چھوڑ گئی۔ ہمارے حکمرانوں نے تاریخ سے سبق نہیں لیا۔ رشوت خوری، کرپشن، دولت جمع کرنے کی ہوس، عالمی سیاسی صورت حال سے بے خبری، مہنگائی، بیروزگاری، انرجی کی قلت، مذہبی انتہا پسندی، قتل و غارت، مایوسی اور ناامیدی نے معاشہ میں جمود پیدا کر رکھا ہے۔ آج فیض زندہ ہوتے تو یقیناً موجودہ سیاسی و معاشی صورت پ نئی راہ دکھاتے۔ ہم سوشلسٹ لوگ عوامی طاقت پر بھروسہ کرتے ہیں۔ مجھے پاکستان کی نئی پود پر مکمل اعتماد ہے کہ وہ موجودہ نیم جاگیرداری، نیم سرمایہ داری نظام کو مٹا کر ایک خوشحال پاکستان کی تعمیر کریں گے۔ 1967ء میں عربوں کی اسرائیل کے ہاتھوں شکست پر کہا تھا ایک مصری شاعر قیانی نے

اے عرب بچو، ساون کے قطرو، مستقبل کو بتا دو تم ہو وہ نسل ہو جو شکست پر غالب آئیگی۔

ہماری نوجوان پود بھی سامراجیت، ملکی اقتدار پر براجمان حکومت کو شکست دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ امن کا پیام یہی ہے اپنے روشن مستقبل کے لئے جدوجہد کرو۔

جس دن شام کی لالی چمکے گی
جس دن چمن کی ہر ڈالی مہکے گی
جس دن امن کی کوئل چہکے گی
جس دن پیار کی چڑیا چہکے گی
جس دن جبر کا ہنیرا مٹ جائے گا
جس دن ظلم کا اندھیرا چھٹ جائے گا
وہ صبح ہماری ہوگی
فیض وہ صبح ہماری ہوگی

(رشید سرابھا)

فیضؔ کا بھی، جالبؔ کا بھی، جوشؔ کا بھی، ساحرؔ کا بھی، خالد یوسف کا بھی، میرا بھی، آپ کا بھی، عوام کا بھی ایک ہی خواب ہے خوشحال پاکستان

فیض چلو ایک اور سورج پیدا کریں
روشنی سے روشنی مانگنا اچھا نہیں لگتا

یونیورسٹی آف گجرات کے زیر اہتمام پاکستانی سماج انسانی حقوق اور اقلیتوں کے خدشات کے حوالہ سے سیمینار ۔۔ایک تجزیہ

افتخار بھٹہ

عالمگیریت جس کے معروض میں عالمی سرمایہ کی بے رحمانہ جبریت اور منافع خوری کا نظام مضمر ہے اس نے انسانی اخلاقیات بالخصوص انسانی حقوق اور وسائل کی تقسیم کے تصورات کی نفی کرتے ہوئے غیر نظریاتی اور غیر سیاسی نظام کی بنیاد رکھی ہے جس میں سیکولرازم کے محض ایک نقطہ نظر جمہوریت کو سماجی اور معاشی انصاف کی کسوٹی قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی اور معاشی ناانصافیوں پر مبنی منڈی کی معیشت کا نظام اپنے ہی سماج کے پسے ہوئے طبقات کے ساتھ سوشل جسٹس کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ماضی میں یورپ میں ہونے والی فرسودہ کلیسائی جاگیرداری نظام کے خلاف صنعتکاری کے ارتقاء کے ساتھ ابھرنے والی انسانی حقوق کی تحریکوں نے جدید روشن خیالی پر مبنی فکر وشعور کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا جس سے ریاستوں نے عوامی مفاد عامہ میں قانون سازی بھی کی تھی۔ جس میں ریاستوں کا حقوق و وسائل کی تقسیم کے حوالہ سے خاصہ رول تھا۔ عہد جدید میں قومی سرمایہ کے مقابلے میں کارپوریٹ سرمایہ کی بالادستی کے بعد ریاست بتدریج اپنے فرائض سے دستبردار ہوئی ہے جس کے نتیجہ میں دنیا کے ترقی یافتہ مما لک میں سرمایہ داری نظام کے بحران کی وجہ سے مظاہرے ہوئے ہیں اور بے چینی میں اضافہ ہوا ہے۔

تیسری دنیا میں انسانی حقوق کی ہمیشہ پائمالی ہوئی ہے۔ وہاں پر عورتوں، بچوں اور اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ ناروا سلوک کیا گیا ہے۔ پاکستان میں اس حوالہ سے ریکارڈ بالکل بہتر نہیں ہے۔ یونیورسٹی آف گجرات نے پاکستانی سماج، انسانی حقوق اور اقلیتوں کے خدشات کے حوالہ سے اقلیتوں کے قومی دن کے حوالہ سے ایک سمینار کا اہتمام کیا۔ اس سلسلہ میں وائس چانسلر ڈاکٹر محمد نظام الدین اور پروفیسر سید شبیر حسین شاہ کی کاوشیں تعریف کی مستحق ہیں کہ انہوں نے عہد حاضر میں جہاں پر ہم نظریاتی، فکری اور سماجی طور پر تنزلی کا شکار ہیں فکری اختلافات نے دشمنیوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اقلیت کے طاقتور تصور نے سچ کہنے پر پابندی لگا رکھی ہے، عدم تحفظ سے دوچار اہل دانش کھل کر بات کرنے سے گریزاں ہیں، میڈیا بھی طاقت کے مظاہر حلقوں، عسکریت پسندوں کے تصورات کو بالواسطہ اجاگر کر رہا ہے۔ اس تنگ نظری نے جامد افکار اور منفی رویوں کے پروان چڑھانے کے عہد میں جدیدیت، روشن خیالی اور عہد حاضر کے سول سوسائٹی کے حقیقی عملی جدوجہد کرنے والے اہل فکر و دانش کو اظہار خال کے لئے پلیٹ فارم مہیا کرنا احسن قدم ہے اور نوجوان نسل کو جدید فکری معاملہ فہمی اور شعور آگہی میں اضافہ کرنا شامل ہے۔ عہد حاضر کے تقاضوں سے منطبق فکری اٹھان سے انسانی رویوں اور مائنڈ سیٹ کو تبدیل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ محترمہ عاصمہ جہانگیر صاحبہ، ممتاز قانون دان عابد حسن منٹو، ڈاکٹر پروفیسر مہدی حسن، ممتاز صحافی اور انسانی حقوق کے علمبردار آئی اے رحمٰن، قمر الزمان کائرہ سابق وفاقی وزیر اطلاعات، پروفیسر شبیر حسین شاہ اور ڈاکٹر نظام الدین کی فکر انگیز گفتگو اور شمولیت سے اس کو واقعی قومی سمینار کا درجہ حاصل ہو گیا۔ شیخ عبدالرشید نے حسب روایت اپنی کمپیئرنگ سے سمینار کے ماحول کو بوجھل نہ ہونے دیا۔ جبکہ جماعت اسلامی کے راہنماء ڈاکٹر طارق سلیم نے اوریا مقبول جان کی نمائندگی کرتے ہوئے اسلام میں انسانی حقوق کے تصور کو اجاگر کیا۔

ممتاق قانون دان مسعود اختر ایڈووکیٹ سیٹیزن فرنٹ کے چیئرمین چوہدری محمد طفیل، سینئر کالم نگار اصغر علی کھرل نے انسانی حقوق کی صورتحال کے بارے میں کھل کر اپنی آراء کا اظہار کیا۔ پروفیسر سید شبید حسین شاہ نے انسانی حقوق کے اقلیتوں کے کینوس کو وسیع کرتے ہوئے تمام پسے ہوئے طبقات کے حقوق اور تحریک کا پس منظر بیان کیا۔ اور اس ضمن میں اجتماعی فکر وعمل میں تبدیلی پر زور دیا۔ محض آئین اور قوانین کی تبدیلی سے انسانی حقوق حاصل نہیں کئے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین نے سمینار کے انعقاد کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا سماج میں مثبت اور صحتمند رویوں کے فروغ اور عہد حاضر کے مسائل کے حل کو سمجھنے کے لئے تاریخ اور سماجیت کا دوسرے سماجوں اور نظریات کے ساتھ تقابلی جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ سوچ کا سفر جاری رہے۔ یونیورسٹی انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حوالہ سے طالبعلموں کی فکری نشستوں کا اہتمام کرے گی۔ انسانی حقوق کے علمبردار اور ممتاز صحافی آئی اے رحمٰن نے کہ انسانی اور اقلیتوں کے حقوق کے تصور اور برصغیر میں قانون سازی کا آغاز 1928ء میں ہوا تھا۔ پاکستان میں اس ضمن میں 1950ء میں قانون سازی کی گئی۔ عام آدمی کو ووٹ کا حق 1970ء میں حاصل ہوا جس سے عوام کو حقیقی جمہوری حقوق حاصل ہوئے۔ مگر آمریتوں نے حقوق کے تصورات اور عملیت پسندی کی پائمالی میں برابر حصہ ڈالا جس کے نتیجہ میں پالیسی ساز اداروں وقتی فوائد کے حصول کے اقدامات سے ہر سطح پر سماجی، لسانی، مذہبی فرقہ وارانہ تضادات میں اضافہ ہوا۔ قائداعظم کی تقریر 11 اگست جو کہ پاکستان میں انسانی حقوق اور جمہوریت کا چارٹر تھا کے برعکس بعض اقلیتوں کو دوسرے درجہ کا شہری قرار دیا گیا۔ ان تضادات کے ابھار میں مخصوص تنگ نظر مکتبہ فکر کا اہم کردار ہے یہی وجہ ہے ہمارا تمام سماج کسی فکری سمت سے عاری ہے۔ انسانی حقوق کا تعلق معاشی اور سماجی انصاف کے ساتھ منسلک ہے جس کے لئے رویوں کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

ممتاز دانشور اور ابلاغیات کے استاد ڈاکٹر مہدی حسن نے کہا کہ تاریخ کے مغالطّوں کی وجہ سے ہم ماضی میں سچائی کی تلاش کی صلاحیت سے محروم کر دیئے گئے۔ ہمیں تاریخ میں جرأت، بہادری اور غیرت کے نام پر صحت مند افکار کے ابھار کی

بجائے محض واقعات کا داستانی تصور ملا ہے جس سے ہم نے خود ساختہ ہیروز کو پروان چڑھایا ہے جن کا ہماری دھرتی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص فرقہ وارانہ مذہبی سوچ اس پر حاوی ہے جو کہ صرف تین فیصد آبادی کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہمارے نصاب میں تاریخ اور سیاست کے حوالے سے تصورات شامل ہیں جن کا حقائق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے مطالعہ سے جیسا مائنڈ سیٹ اور معاشرتی آؤٹ لک سامنے آسکتی ہے وہ سماج کی ٹوٹ پھوٹ کی شکل میں عیاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تعصّبات کی زد میں ہیں۔ منتشر الخیال سماج کبھی ترقی کی راہ پر استوار نہیں ہوسکتا ہے۔ تعلیمی سلیبس ہو بالخصوص تاریخ اور سیاست کی نظر ثانی کی ضرورت ہے تا کہ سماج میں فکری شعور اور متعدل رویوں کو فروغ دیا جا سکے۔ اس عمل میں دانشور طبقات اور سیاسی جماعتوں کو اجتماعی کردار ادا کرنا ہے۔

انسانی حقوق کی علمبردار اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی صدر محترمہ عاصمہ جہانگیر نے کہا کہ ریاست کے بعض اداروں نے اپنے مخصوص مقاصد کار اور قدامت پسند طبقات کی حمایت حاصل کرنے اور سامراج کے مخصوص نظریاتی سماجی اور فوجی حکمت عملیوں کے پس منظر میں سماج میں تقسیم کے عمل کو تیز کیا۔ انسانوں کی حقوق کی جدوجہد کو مخصوص مذہبی فرقہ وارنہ رنگ دینے کی کوشش کی جس سے نفرت اور تعصّبات میں ہر سطح پر اضافہ ہوا۔ ان پالیسیوں کے نتائج پر تشدد رویں کی شکل میں بھگت رہے ہیں۔ ہمارے ہزاروں شہری دہشت گرد کاروائیوں میں مارے جا چکے ہیں مخصوص فکر کی وجہ سے انسانی حقوق کا تصور ختم ہو کر رہ چکا ہے۔ عورتوں، بچوں اور اقلیتوں سے ناروا سلوک کیا جا رہا ہے۔ انکی بستیوں کو جلا دیا جاتا ہے، تبدیلی عقائد کے حوالہ سے پر تشدد رویے ہیں۔ عدالتیں اپنی افادیت کھو رہی ہیں کیونکہ مظلوم کو انصاف کے مساوی مواقع مہیا نہیں کئے جا رہے ہیں۔ ہم اپنے تنگ نظر رویوں کی وجہ سے جمہوریت کی موجودگی کے باوجود عالمی سطح پر تنہا ہو رہے ہیں۔ ہمیں بیرونی سے زیادہ اندرونی چیلنجوں کا سامنا ہے۔ ہمیں سماج کو تباہی سے بچانے کے لئے اپنی فکر، سوچوں اور رویوں کو درست سمت میں استوار کرنا ہوگا۔ اقلیتوں، عورتوں اور بچوں پر ظلم اور ناروا سلوک کے خاتمہ کے لئے فکری انقلاب برپا کرنا ہوگا میڈیا کو بھی اس ضمن میں اپنے کردار و عمل پر غور کرنا ہوگا۔

دانشور اور ممتاز قانون دان عابد حسن منٹو نے کہا کہ سماج میں پیدا ہونے والے پر تشدد رویوں اور مائنڈ سیٹ کے محرکات کا جائزہ لینا ضروری ہے یہ حالات و واقعات یکدم رونما نہیں ہوئے ہیں۔ انکے بگاڑ میں ہماری آزادی کے بعد ریاستی اشرافیہ کی مخصوص فکر شامل ہے جس کی اکثریت جاگیرداروں پر مشتمل ہے۔ وہ پارلیمنٹ میں اکثریت رکھتے ہیں، سرکاری اداروں، کاروبار اور صنعت میں ان کو بالادستی حاصل ہے۔ یہ تمام طبقات مل کر محدود مقاصد کار کا نظام برقرار رکھنا چاہتے ہیں جن میں آزادانہ فکر اور شعور کے بجائے غلامی کا تصور حاوی ہے۔ جدیدیت اور روشن خیال رویوں کو دبانے کے لئے میڈیا اور مخصوص فکر رکھنے والی جماعتوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ حقوق کے انام محض ووٹ کے حق کا استعمال نہیں ہے۔ آج جاگیردارانہ علاقائی اجارہ داریوں کی وجہ سے دیہی علاقوں کا ووٹر اظہار رائے کے لئے آزاد نہیں ہے۔ جمہوری نظریاتی اور انسان دوست رویوں، معاشی اور سماجی حقوق کی بات کرنے والوں کی زبان بند کی جا رہی ہے۔ پورا سماج فکری جمود اور بانجھ پن سے دوچار ہے۔ مخصوص نظریاتی اقلیت اپنا ایجنڈا اکثریت پر طاقت کے زور پر نافذ کرنا چاہتی ہے جس سے نوجوان نسل، بچے اور عورتیں خوف و ہراس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ عالمی سامراج نے انسانی حقوق کے نام جمہوریت کی بات تو کی ہے مگر سرمایہ دارانہ پس منظر میں عوام کو معاشی حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ منافع کمانے کی ہوس نے سرمایہ داری نظام کو بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ آج امریکہ میں غربت میں اضافہ ہو رہا ہے، جرمنی اب یورپ کا معاشی بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہے، برطانیہ بھی محض اپنے ملک کی سرحدوں تک محدود ہو رہا ہے۔ دنیا کے عوام آج معاشی حقوق کے تحفظ کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ جبکہ ہم نے انسانوں کی مختلف فکری طبقات میں تبدیلی کا عمل تیز تر کر دیا ہے۔ آج ہم انسان کے علاوہ سب کچھ ہیں۔ اگر ہم نے ان منفی رویوں کے خلاف بند تعمیر کرنے کی کوشش نہ کی تو ہماری داستان نہیں ہوگی داستانوں میں۔

دانشوروں کو معذرت خواہانہ روایہ اختیار کرنے کی بجائے کھل کر اظہار خیال کرنا ہوگا تا کہ آمریتوں کے تنگ نظر مائنڈ سیٹ اپ کو نظریاتی تربیت کے ذریعہ تبدیل کیا جا سکے اور ہم انسانی عظمت کے حقیقی تصور کی عملی تصویر کی تشکیل کر سکیں جو کہ معاشی اور سماجی حقوق کے ساتھ منسلک ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری اطلاعات قمر الزمان کائرہ ایم۔ این۔ اے۔ جو کہ ایک مخصوص نقطہ نظر اور زاویہ فکر رکھتے ہیں ان کی حالات و واقعات، سیاست، معیشت اور معاشرت پر گہری نظر ہے انہوں نے کہا کہ ہماری حکومت کی کامیابیوں کے ساتھ ناکامیابیاں بھی ہیں۔ ہم نے آئین میں اٹھارویں ترمیم کے ذریعہ اس کو 1973ء کے حقیقی آئین میں تبدیل کیا ہے۔ این۔ ایف۔ سی۔ ایوارڈ کے ذریعہ صوبوں کے مالیاتی حقوق میں اضافہ کیا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف بھرپور کاروائی کی ہے، ملک میں باہر سے آنے والی وقوم میں اضافہ ہوا ہے، کرنٹ اکاؤنٹ کی صورت حال تسلی بخش ہے، مگر کچھ معاملات میں ہمیں کامیابی نہیں ہوئی ہے جس میں توانائی کا بحران ہے جس کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم چونکہ کولیشن حکومت ہیں اس لئے اتحادیوں کے مطالبات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آئین میں آٹھویں ترمیم کی موجودگی یہی جواب طلب معاملہ ہے۔ کئی معاملات پر بحث اور مذاکرے کی ضرورت ہے۔ ہماری حکومت مفاہمتی ایجنڈے پر کام کر رہی ہے۔ ہمیں فرقہ واریت کے خاتمہ کے لئے متحد ہو کر جدوجہد کرنی چاہئے محض قوانین سازی اور عدلیہ کے ذریعہ سماج کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی آف گجرات کو سیمینار منعقد کرنے پر مبارک باد دی۔ سیمینار کا حاصل عابد حسن منٹو، ڈاکٹر مہدی حسن اور آئی اے رحمٰن کے ساتھ افطاری میں پر مغز گفتگو تھی جس میں سماج میں مثبت جمہوری اور انسانی رویوں کے علاوہ معاشی اور سماجی سدھار کے بارے میں گفتگو کی گئی۔ بہر صورت ڈاکٹر محمد نظام الدین کی شخصیت اس منتشر الخیال سماج میں ایک برگد کی حیثیت رکھتی ہے جس کے شجرِ سایہ دار میں اہل علم و فکر کو شعور و آگہی کی ٹھنڈی ہوا نصیب ہوتی ہے جس سے فکر کے نئے شگوفے پھوٹتے ہیں۔

پاکستان میں فوج زبردست قوت ہے، زمینیں، ملز اور بینکوں سے لے کر لیزنگ کمپنیوں تک متعدد کاروبار اس کی ملکیت میں ہیں

ترقی پسند جمہوری قوتیں عوام کو حقوق ملنے تک جدوجہد جاری رکھیں گی، چوہدری فتح محمد

چوہدری فتح محمد نے عوامی جدوجہد کی راہ میں 18 برس جیلوں میں گزارے، پروفیسر نذیر تبسم کی طرف سے بریڈفورڈ میں عشائیہ سے خطاب

پاکستان ورکرز پارٹی پاکستان (پنجاب) کے صدر اور ممتاز ترقی پسند راہنماء چوہدری فتح محمد نے کہا ہے کہ پاکستان کی فوج براہ راست اقتدار میں نہ بھی ہو تو حکم اسی کا چلتا ہے، فوج ایک زبردست قوت ہے، جو پاکستان کے معاشی اور اقتصادی میدان پر بھی پوری طرح چھائی ہوئی ہے، زمینوں سے لے کر ملوں تک اور بینکوں سے لے کر لیزنگ کمپنیوں تک بہت سے کاروبار اس کی ملکیت میں ہیں اور وہ مجموعی طور پر ملک کی 26 فیصد کی مالک ہے۔ چوہدری فتح محمد ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے پروفیسر نذیر تبسم کی طرف سے دیئے گئے عشائیہ میں اظہار خیال کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ قیام پاکستان سے لے کر آج ملک کی ترقی پسند جمہوری قوتیں ملک میں عوامی جمہوری نظام قائم کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں اور ان کی یہ جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک پاکستان کے پسماندہ اور کچلے ہوئے عوام کو ان کے بنیادی حقوق نہیں مل جاتے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان بنا تو پاکستان کے حصہ میں وہ علاقے آئے جو ہر لحاظ سے پسماندہ تھے تعلیمی میدان میں انتہائی پسماندگی کی بڑی وجہ وہ جاگیردارانہ نظام تھا جو مختلف شکلوں میں پاکستان کے تقریباً سب ہی صوبوں میں رائج تھا۔ اور آج بھی فوج کے بعد پاکستان میں جاگیرداروں کی ہی حکومت ہے۔ پنجاب کے جاگیرداروں، سندھ کے وڈیروں اور خیبر پختونخواہ کے خوانین اور بلوچستان کے قبائلی سرداروں نے جمہوریت کو کچھ اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ چاہے کوئی بھی پارٹی الیکشن جیتے اقتدار میں یہی جاگیردار، وڈیرے اور قبائلی سردار شامل ہوتے ہیں۔ یہ جس بھی جماعت میں جاتے ہیں اس جماعت کے نام سے ووٹ لے کر اپنا حق حکمرانی قائم رکھتے ہیں انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے عوام میں کسی حد تک سیاسی شعور آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ جمہوری اداروں کی مضبوطی اور کرپشن کے خاتمہ کے مطالبات کرتے ہیں۔

سیاسی جماعتیں اقتدار کے لئے تو اکٹھی ہو جاتی ہیں لیکن تبدیلی کے لئے اکٹھی نہیں ہوتیں۔ پاکستان میں ہمیں چہروں کی تبدیلی نہیں نظام کی تبدیلی چاہئے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک پاکستان کی تمام ترقی پسند قوتیں، پاکستان کے محنت کش، چھوٹے تاجر، مزدور اور دانشور ایک پلیٹ فارم پر متحد نہیں ہو جاتے۔ انہوں نے کہا کہ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ پاکستان بنانے والی جماعت مسلم لیگ کو محض اپنا اقتدار بچانے کے لئے قیام پاکستان کے بعد ان جماعتوں سے اشتراک کرنا پڑا جو قیام پاکستان کے ہی خلاف تھیں۔ پہلے اقتدار کے لئے مذہبی جماعتوں کا سہارا لیا گیا پھر بیوروکریسی سے مدد لی گئی، امریکہ میں تعینات ایک سفیر کو بلوا کر ملک کا وزیر اعظم بنا دیا گیا بعد میں وزیر دفاع نے خود اپنے ملک میں مارشل لاء لگاتے ہوئے ظلم، جبر اور تشدد کی ایک ایسی روایت قائم کی جو حالیہ برسوں تک جاری رہی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے ترقی پسندوں کا مطالبہ ہے کہ زمین کی حد ملکیت میں 25 ایکڑ کی حد قائم کی جائے، جاگیردارانہ نظام اور بیروزگاری کو ختم کر کے خود کفالت کی بنیاد پر غیر ملکی قرضوں سے نجات حاصل کی جائے۔ انہوں نے اپنے اس عزم کو دہرایا کہ وہ ملک میں جمہوری نظام کے قیام تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

پروفیسر نذیر تبسم نے کہا کہ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے ادوار میں چوہدری فتح محمد نے عوامی جدوجہد کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی زندگی کے 18 برس جیلوں میں گزارے، ان کا شمار ان سیاسی کارکنوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ایوب خان، یحییٰ خان اور بھٹو دور میں بھی جیلیں کاٹیں اور اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ زیر زمین رہ کر تحریک کی کامیابی کے لئے کام کرتے ہوئے گزارا۔ سابق لارڈ میئر محمد عجیب نے تقریب کی صدارت کی جبکہ درون سنگھ، محسن اور نعمت چوہدری نے عوامی تحریک کے حوالے سے کئی ایک سوالات پوچھے۔

ورکرز پارٹی پاکستان پنجاب کا اجلاس

ظفر اقبال چودھری

ورکرز پارٹی پنجاب کی ایگزیکٹیو کمیٹی کا اجلاس مورخہ 24 جولائی 2011 کو بوقت 10 بجے دن سول لائن خانیوال میں منعقد ہوا۔اجلاس کے ایجنڈے کے تحت 20 مارچ 2011 کے صوبائی سیکرٹریٹ کے اجلاس منعقدہ لاہور کے فیصلوں پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے علاوہ تنظیمی صورت حال مختلف محاذوں پر کام کی رفتار اور اضلاع میں موجودہ تنظیمی صورت حال اور ملک میں سیاسی صورت حال کے حوالے سے تفصیلی بحث کی گئی اجلاس کی صدارت قائم مقام صدر صوبہ پنجاب جناب ظہور احمد خان نے کی جبکہ شریک اراکین میں شفیق الماس لودھراں، سید احمد حسن شاہ اوکاڑہ عارف ایاز فیصل آباد ،اختر اعوان ملتان ،فرحت عباس ملتان، زاہد پرویز لاہور، عابدہ چوہدری ،نصیر ہمایوں ،عاشق حسین لاہور، راجہ محمد یونس وہاڑی، حمزہ ورک، رانا اورنگزیب ،عمران شعیب پاکپتن، محمد زبیر ٹوبہ ٹیک سنگھ، خالد پرویز گل، ناصر اقبال ساہو، محمد شفیع ٹانگرہ، ظفر اقبال چوہدری خانیوال، عبدالکریم کیرالا، غلام دستگیر محبوب شیخوپورہ شامل تھے۔محمد اسلم ملک اور ملک محمد علی بھارا مبران سنٹرل کمیٹی نے بھی اجلاس میں شرکت کی ۔اجلاس میں حسب ذیل فیصلے کئے گئے۔

1۔تمام اضلاع کے ضلعی عہدیداران کے نام پتہ جات وٹیلی فون نمبر گذشتہ اجلاس کے فیصلہ کے تحت موصول نہ ہوئے ہیں لہذا تمام ضلعی صدر، سیکرٹری جلد از جلد مطلوبہ کوائف صوبائی سیکریٹری کو روانہ کریں۔

2۔نعیم شاکر صاحب نے مختصر تعارفی بروشر کا ڈرافٹ نہ بھجوایا ہے۔صوبائی صدر نعیم شاکر سے اس سلسلہ میں رابطہ کر کے بروشر کی دستیابی کو یقینی بنائیں گے۔

3۔ڈیموکریٹک لائیرز (DLF) کا لیٹر پیڈ لاہور پارٹی شائع کرا کر تمام اضلاع کو بھیجے گی اور یہ کام زاہد پرویز صاحب 20 یوم میں کریں گے۔

4۔27 مئی 2011 کو لاہور میں مجوزہ کسان ریلی کے پروگرام کو سنٹرل ایگزیکٹیو کمیٹی نے ملتوی کر دیا تھا اجلاس میں کسان ونگ کی صورت پر غور وخوض کے بعد تمام اضلاع کو ہدایات کی گئی کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں کسان کمیٹیاں قائم کرنے کا کام زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے عرصہ میں مکمل کریں

5۔عوامی جمہوریت کیلئے رپوٹس اور مضامین ہر ماہ کی 10/12 تاریخ تک پہنچ جانی چاہیں نیز ہر ضلع اپنی ڈیمانڈ کے مطابق عوامی جمہوریت کیلئے فنڈز ادا کرے کم از کم مبلغ 500 صد ماہوار ہر ضلع لازمی ادا کرے جو نعیم شاکر کو بھیجا جائے۔پتہ یہ ہے۔نعیم شاکر ایڈووکیٹ حسن پلازہ 1۔مزنگ روڈ، لاہور۔

6۔صوبائی پارٹی کے فنڈز کا حساب کتاب صوبائی سیکریٹری فنانس زاہد پرویز نے اجلاس میں پیش کیا جن اراکین کے ذمہ صوبائی فنڈ واجب الادا ہے وہ جلد از جلد ادا کریں فنڈ بھیجنے کا پتہ :۔زاہد پرویز ایڈووکیٹ، الوکیل پلازہ 9 فین روڈ لاہور ہے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ صوبائی فنڈ صدر /جنرل سیکرٹری اور فنانس سیکریٹری مشاورت سے خرچ کریں گے۔

7۔اجلاس میں حسب ایجنڈا کسی بھی ضلع کی رپورٹ تحریری طور پر پیش نہ گئی تھی تاہم زبانی پیش کی گئی رپورٹس سے یہ صورت حال واضح ہوئی کہ تحصیل اور شہری یونین کونسل سطح پر تنظیمی صورت حال غیر تسلی بخش ہے اور چند اضلاع کو چھوڑ کر باقی ضلعی تنظیموں کی غیر فعالیت ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتی ہے۔لہذا تمام پارٹی تنظیموں کو ہدایت کی گئی کہ اپنے کام میں باقاعدگی پیدا کریں اور جس سطح پر بھی تنظیمی خلا موجود ہے اُسے پر کیا جائے۔

8۔پارٹی کی صوبائی مجلس عاملہ کا آئندہ دو روزہ اجلاس مورخہ 30-29 اکتوبر 2011 کو ضلع اوکاڑہ میں منعقد ہوگا۔

ورکرز پارٹی پاکستان ضلع شیخوپورہ.....فضل پورہ یونٹ کا قیام

پارٹی ہر آڑے وقت میں محنت کش عوام کا ساتھ دے گی

رپورٹ: محمد عمران

31 جولائی 2011 منوں آباد جی ٹی روڈ کے بالمقابل آبادی فضل پورہ (ڈُبن پورہ) تحصیل مرید کے ضلع شیخوپورہ ورکرز پارٹی پاکستان نے ایک شاندار تقریب میں یونٹ کے قیام کا اعلان کیا۔تقریب کے روح رواں عدنان اشرف ریحان تھے۔درجنوں نوجوان سیاسی کارکنوں نے دو گھنٹے متواتر راہنماؤں کے خیالات سے استفادہ کیا اور جم کر بیٹھے رہے۔محنت کشوں کی آبادیاں ایک طرف بنیادی شہری سہولتوں سے محروم ہیں دوسری طرف ان آبادیوں میں رہنے والے غریب محنت کش قبضہ گروپوں اور حکمران سیاسی پارٹیوں کے چیلوں کے ہاتھوں غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ان آبادیوں میں مختلف قسم کے مافیا راج کرتے ہیں۔یہی صورت حال فضل پورہ کے غریب محنت کش عوام کو درپیش ہے۔31 جولائی کا دن ایک طرح اُن کے لئے عزم وہمت آزمانے کا دن ہے جب انہوں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا فیصلہ کر کے ایک باعزت زندگی گزارنے کا عہد کیا ہے۔تقریب سے خطاب کرنیوالوں میں صفدر حسین سندھو ایڈووکیٹ مرکزی سیکرٹری اُمور محنت ورکرز پارٹی پاکستان، چوہدری عبدالکریم کیرالا ایڈووکیٹ ممبر صوبائی کمیٹی ورکرز پارٹی وسرپرست غریب اتحاد انجمن شمیہ پاکستان، صفدر حسین ہاشمی نائب صدر ورکرز پارٹی ضلع شیخوپورہ ،چوہدری رفیق فنانس سیکریٹری ورکرز پارٹی ضلع شیخوپورہ،

باقی صفحہ نمبر 19 پر

سی آر اسلم کی برسی پر منعقدہ سیمینار ''پاکستان میں بائیں بازو کی سیاست کا سفر اور مستقبل''
کی تصویری جھلکیاں

CPL NO. 279

MONTHLY AWAMI JAMHURIAT
August, 2011
LAHORE

شہر صلیب

محمد انوار المصطفےٰ ہمدی

جس نے دھرتی پہ سُورج اُگائے یہاں
اُس سے گھر کا اندھیرا نہ ٹالا گیا
وہ جو خُو شبو کے نغمات بُنتا رہا
اُس کو نوکِ سناں پر اُچھالا گیا

آنکھ میں ہے بہاروں کا سپنا مگر
اُس کی تعبیر سے رس رہا ہے لہو
دندناتی ہے وحشت یہاں آج بھی
اب بھی جلتی ہے انسان کی آب رُو

ظلم آزاد ،مظلوم محصور ہے
اور بینائی قانون کی کھو گئی
جرم کوئی کرے کوئی بھرے بے خطا
زندگی کتنی بوجھل یہاں ہوگئی

خاک اُڑتی ہے تھانے میں مجبور کی
پگڑیاں خود محافظ گرانے لگے
بیٹھ کر اپنی غیرت کے لاشے پہ یہ
نوچ کر جسم انساں کا کھانے لگے

اس وطن کے حسیں مرمریں جسم کو
ناگ بیوروکریسی کا ڈستا رہا
جوگر فتار صدمات برسوں سے ہے
اُس کو اپنے شکنجے میں کستا رہا

کرسیاں وہ جو مفلس کا حق ہیں یہاں
اُن پہ اپنے چہیتے بٹھاتا ہے یہ
نور دیتی بصیرت کو دھتکار کر
بے بصیرت پہ چاہت لُٹاتا ہے یہ

جن کا منصب تھا ظالم کو للکارنا
اب وہ شاعر خرافات میں کھوگئے
ٹالنی تھیں جنہیں شب کی تاریکیاں
وہ ستاروں کی بارات میں کھوگئے

کب سکھایا ہے اسلام نے یہ سبق
خونِ ناحق سے اپنی قبا رنگ لو
نفرتوں کی سیاہی سے دنیا میں تم
اپنی دستار جُبّہ، عصا، رنگ لو

ایستادہ یزیدوں کی صف میں بھی ہے
گارہا ہے ترانے شہیدوں کے بھی
ظالموں سے خراج اپنی چپ کا بھی لے
لوٹ لیتا ہے گھر یہ غریبوں کے بھی

ظلم کو کیسے للکارتا یہ بھلا
بیچ دیتا ہے جو دین کی عصمتیں
بھول کر اپنے منصب کی تقدیس کو
مانگتا ہے جو آقاؤں سے خلعتیں

قربِ شاہ میں گزر جائیں جو چند پل
اُن کو سرمایۂ جاں سمجھتا ہے یہ
کِس ادب سے جھکاتا ہے گردن وہاں
حکم شاہی کو ایماں سمجھتا ہے یہ

شکلِ مومن میں ملاں ہے شر آج بھی
دیں کے پردے میں فتنے جگاتا ہے یہ
بولتا ہے تو اُٹھتا ہے منہ سے دُھواں
دین کے نام پر گھر جلاتا ہے یہ

سر پٹختی ہے دانش یہاں آج بھی
حکمران آج بھی ہے جہالت یہاں
اس سے پہلے کے حالات بھی تھے یہی
بدترین آج بھی ہے یہ حالت یہاں

پھر عجب کیا کہ بدلی نہیں یہ رُتیں
کیا تعجب جو پھیلا ہے شر آج بھی
آج بھی وقت ہے سوچنا ساتھیو
کیوں گریزاں ہے ہم سے سحر آج بھی

شہر جلتے رہے رات دن اور یہ
راگ جمہوریت کے سناتے رہے
پھول بھرتے رہے اپنے دامان میں
اور بدلے میں کانٹے بچھاتے رہے

بھوک میں جو غذا کو ترستا رہا
اُس کی جھولی میں نعرے ہی ڈالے گئے
اُس کی جانب نہ دیکھا پلٹ کر کبھی
جس کی بیٹی کو ظالم اُٹھالے گئے

بارشِ غم ہے پھر بھی یقیں ہے مجھے
گہری دلدل سے پاؤں نکل جائیں گے
پل رہی ہیں جہاں سازشیں موت کی
زلزلوں سے وہ ایواں دہل جائیں گے

غفلتوں میں گھری قوم اُٹھ تو سہی
اُٹھ کہ تیرا مقدر بدلنے کو ہے
اُٹھ گرادے فصیلیں ہر اک ظلم کی
دیکھ اُس پار سورج نکلنے کو ہے